Scanned by CamScanner

غالب کی کہانی

یعنی مرزا اسد اللہ خاں غالب دہلوی کی زندگی اور ان کی نظم و نثر کی

بچّوں سے

رُوشناسی

حسب ارشاد و ہدایت

فضیلت مآب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم

صدر جمہوریہ ہند

مصنّفہ

محمد شفیع الدین نیّر۔ نیّر منزل۔ جامعہ نگر
نئی دہلی۔ ۲۵

پہلی بار سنہ ۱۹۶۸ء دو ہزار

دوسری بار سنہ ۱۹۷۱ء ایک ہزار

قیمت ــــ دو روپیہ ۵۰ پیسے صرف علاوہ محصول ڈاک

ٹائیٹل :ــــ جناب فیروز صاحب آرٹسٹ

تصویریں :ــــ جناب عبید الحق صاحب آرٹسٹ

خوشنویس :ــــ جناب امان اللہ صاحب صدیقی

چھپائی :ــــ جمال پرنٹنگ پریس، دہلی

ٹائیٹل کی چھپائی :ــ فائن پریس۔ دہلی

ناشر :ــــ نیئر کتاب گھر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵

"منظور ہے گذارشِ احوالِ واقعی"

بعالی خدمت فضیلت مآب جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب قبلہ مدظلہم

مخدوم و مطاعِ بندہ سلامت

بعد آداب کے عرض یہ ہے کہ پانچ سال کے قریب ہوئے محترم شیخ الجامعہ جناب پروفیسر محمد مجیب صاحب کا یہ پیغام ملا کہ مرزا غالب مرحوم کی صد سالہ جوبلی کے موقع پر مرزا صاحب کو بچوں سے روشناس کرنے کی خدمت آں ممدوح نے اس ناچیز کو تفویض فرمائی ہے۔

میں نے اپنی صوابدید کی روشنی میں مذکورہ موضوع کے مقاصد اور حدود متعین کر کے کام شروع کر دیا۔ تین سال تک یہ کام کرتا رہا۔ بتاریخ ۲۹ رنومبر ۱۹۶۵ء اپنی محنت اور مطالعہ کا نتیجہ "حُسنِ غالب" نامی کتاب کے نامکمّل مسوّدہ کی صورت میں خدمتِ والا میں پیش کیا۔

آں ممدوح نے ملاحظہ فرمانے کے بعد از راہِ شفقت اور حوصلہ افزائی اس مسوّدہ کو پسند فرمایا۔ اور اپنی خوشنودی کا اظہار کیا۔ تاہم اس کی ضخامت

اور حجم کے پیشِ نظر جناب نے یہ ہدایت فرمائی کہ میں اَسّی نوّے صفحہ کا ایک کتابچہ تیار کروں۔

مجھے اس دوران میں اس کام کی دشواریوں کا اندازہ ہو چکا تھا اس لیے ایک ملاقات میں میں نے عرض کیا کہ کتابچۂ مذکور کی نگارش اور تیاری جس فراغت اور یکسوئی کی متقضی ہے وہ مجھے میسر نہیں۔ تاہم میں نے یہ کام جاری رکھا۔ اگر یہ کوشش کامیاب رہی تو میں اسے آپ ہی کے فیضِ باطنی کا تصرف سمجھوں گا۔

میں نہایت ادب کے ساتھ اپنی محنت اور کاوش کا یہ نتیجہ "غالب کی کہانی" کے نام سے ۲۸ / جون ۱۹۶۸ء کو خدمتِ والا میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کروں گا۔

اس کتابچہ کی تحریر اور ترتیب میں بچوں کی ذہنی تربیت، فہم اور دلچسپی میرے پیشِ نظر رہی ہے۔ اس لیے:

(۱) تاحدِّ امکان زبان اور اُسلوبِ بیان آسان، عام فہم اور دلچسپ رکھنے کی کوشش کی ہے۔

(۲) مرزا صاحب کی زندگی کے ایسے واقعات اور اُن کی نظم و نثر کے ایسے انتخابات تلاش کیے ہیں جو بچوں کے مناسب حال اور ان میں ادبی ذوق بیدار کرنے میں معاون ہوں۔

اس سلسلے میں، میں نے مرزا غالب ہی کی نظم اور نثر کو اپنا رہنما بنایا ہے میری کوشش معلومات اور تفصیل کو محدود رکھنے کی رہی ہے۔ تاہم یہ بات نظر انداز نہیں ہوسکی کہ یہ کتابچہ بہرحال غالب جیسے نکتہ شناس اور معنی آفرین شاعر اور بلند پایہ نثر نگار کی شخصیت اور ان کے کلام پر مبنی ہے۔

(۳) بچوں کی سہولت کے خیال سے مضمون کتابچہ کو مختلف مختصر حصوں میں تقسیم کر دیا ہے۔

الغرض میرا مقصد یہ ہے کہ یہ کتابچہ بچوں میں حضرت غالب کی نظم اور نثر کے مطالعہ کا شوق پیدا کرے۔ اور ان کی ذہنی تربیت اور ذوقِ ادب کی بنیاد بنے۔

میری تمنا ہے کہ اللہ تعالیٰ میری اس محنت اور کاوش کو حُسنِ قبول عطا فرمائے اور میں آں ممدوح کی سندِ پسندیدگی سے بہرہ مند ہوں

فقط زیادہ ادب

خاکسار
محمد شفیع الدین نیّر

نیّر منزل۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی۔ ۲۵
محررّہ ۲۶ رجون سنہ ۱۹۶۸ء

شکریہ

مرزا غالب جیسے دیدہ ور اور معنی آفرین شاعر کو اُن کی صد سالہ برسی کے یادگار موقع پر بچّوں سے روشناس کرنے کی خدمت مجھ ناچیز کو سپرد فرما کر صدر جمہوریۂ ہند جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب مرحوم نے وہ اعزاز بخشا ہے جس کے شکریہ کا حق، حق تو یہ ہے کہ ادا نہیں ہو سکتا۔

موصوف نے "غالب کی کہانی" کا مسودہ بتمام و کمال ملاحظہ فرمانے کے بعد اپنی خوشی اور پسندیدگی کا اظہار فرمایا۔

میرے لیے گراں قدر تحسین و داد کے وہ جملے ہیں جو حضرت کے سکریٹری نے اپنے مکتوب میں تحریر کیے ہیں:-

"آپ کا کام واقعی بہت اچھا ہے۔ صدر موصوف اِس مسودہ کو پڑھ کر بیحد مسرور اور محظوظ ہوئے ہیں"

میں مجلس تعلیمی جامعہ اردو علی گڑھ کا احسان مند ہوں کہ اُس نے یہ کہانی اپنے امتحانِ ادیب کے نصاب میں شامل کی۔ میں اُن عزیزوں اور دوستوں کا بھی شکر گزار ہوں جنہوں نے اِس کی اشاعت میں اعانت فرمائی۔ اُن اردو اور انگریزی اخباروں اور رسالوں کا بھی شکریہ ادا کرتا ہوں، جنہوں نے اپنے گراں قدر اخباروں اور رسالوں میں بڑے حوصلہ افزا تبصرے شائع فرمائے۔ مجھے امید ہے کہ اس پسندیدگی کی برکت سے یہ کتاب ملک میں مزید مقبولیت حاصل کرے گی۔

خاکسار

محمد شفیع الدین نیّر

نیّر منزل۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی ۲۵

۲۰ مئی ۱۹۷۱ء

غالب کی کہانی

عنوانات کی ترتیب

۱۔ پہلا باب ۹

۱ اللہ کے نام سے ابتدار ۹

۲ مرزا غالب کون ہیں؟ ۱۳

۳ مرزا غالب کا بچپن، تعلیم اور تربیت ۱۷

۴ شاعری کا شوق۔ ابتدائی شاعری کا نمونہ ۲۰

۵ شادی خانہ آبادی۔ دہلی کی سکونت ۲۳

۶ مرزا صاحب کے خاص خاص سفر ۲۶

۷ مرزا صاحب کی قلعۂ معلّٰی سے وابستگی۔ ۳۰

۸ قلعۂ معلّٰی سے وابستگی کی خوشگوار یادیں ۳۶

۹ مغلیہ حکومت کا خاتمہ مرزا صاحب کی پریشانیاں ۳۹

۱۰ بیماریاں۔ بڑھاپا۔ وفات ۴۲

۲۔ دوسرا باب ۵۰

(۱۱) مرزا غالب کی شاعری ۵۰

(۱۲) مرزا غالب کی غزلیں ۵۶

(الف) حُسن اور عشق کی کارفرمائی

(ب) اخلاقی تعلیم ۶۳

(ج) ایسے شعر جو ضرب المثل کے طور پر استعمال ہوتے ہیں ۶۷

(د) معنیٰ آفرینی ۷۱

(ہ) بہاریہ غزل ۷۶

(و) ایک پوری غزل نمونہ کے طور پر۔ ۷۶

۳۔ تیسرا باب ۷۸

۱۳ کلامِ غالب کی باقی قسمیں۔ ۷۸

(الف) قصیدہ ۷۸

(ب) مثنوی ۷۹

(ج) مرثیہ گوئی ۸۰

(د) رباعی ۸۲

(ہ) قطعہ ۸۵

۴۔ چوتھا باب ۹۱
۱۴ مرزا غالب کی نثر نگاری
ادائے مطلب ۹۱
شوخی و ظرافت ۹۸
اظہار ہمدردی ۹۹
۱۵ خطوں کے نمونے ۱۰۱
(۱) رواداری ۱۰۱
(۲) بیوی کی تسلی اور تشفی ۱۰۱
(۳) شفقت کا اظہار ۱۰۳
(۴) رامپور کے قیام کا حال ۱۰۴
(۵) واقعہ نگاری ۱۰۵
(۶) مشفقانہ مشورہ ۱۰۶
(۷) سفارش ۱۰۶
(۸) فرمائش ۱۰۸
(۹) بیمار پرسی ۱۰۸
(۱۰) گھڑی کے تحفہ کا شکریہ ۱۰۹
(۱۱) والی ریاست کی عیادت ۱۱۰
(۱۲) ظرافت آمیز اظہارِ غضب ۱۱۱
(۱۳) تاکید اور تنبیہہ ۱۱۲
(۱۴) ہدایت ۱۱۳
(۱۵) شوخی اور ظرافت ۱۱۳
(۱۶) بزرگانہ شفقت ۱۱۵
(۱۷) بچے کی طرف سے شکریہ کا خط ۱۱۶
(۱۸) ایک بچے کے نام خط ۱۱۸
۵۔ پانچواں باب ۱۲۰
۱۶ مرزا غالب کے اخلاق اور عادات ۱۲۰
خاتمہ ۱۲۶

پہلا باب

اللہ کے نام سے ابتدا

سو برس ہوئے ہمارے دیس میں ایک شاعر تھے۔ ان کا نام اسداللہ بیگ خان تھا۔

وہ ایک خوش مزاج اور ہنس مکھ انسان تھے۔ جو بھی ان سے ملتا۔ ان کی بات چیت سے اس کا دل باغ باغ ہو جاتا۔ وہ باتیں اس طرح کرتے گویا ان کے منہ سے پھول جھڑ رہے ہیں۔ کسی کو دکھ میں دیکھ کر ان کو بھی دکھ ہوتا۔ اس دکھ کو دور کرنے کے لیے ان سے جو کچھ بن پڑتا۔ اس میں دریغ نہ کرتے۔ غرض انھیں انسانوں سے پیار تھا۔ اور اچھے انسان میں جو خوبیاں ہونی چاہئیں وہ سب ان کی ذات میں جمع تھیں۔

اردو میں ہزاروں شاعر اور ادیب ہوئے ہیں اور ہزاروں آج

بھی موجود ہیں۔ مگر اِس زبان کی نظم اور نثر میں جو مرتبہ مرزا غالب کا ہے وہ کسی اور شاعر یا ادیب کا نہیں۔

اُردو نظم کا تو کہنا ہی کیا ہے۔ اُردو نثر میں بھی جو خط آپ نے لکھے ہیں وہ اپنے رنگ ڈھنگ میں انوکھے اور نرالے خیال کئے جاتے ہیں۔

اتنی مدّت گزر جانے اور اُردو زبان کی اتنی ترقّی ہو جانے پر بھی شاعری اور خط و کتابت میں اب تک اُن کا بدل پیدا نہیں ہو سکا۔ ایک بات البتّہ عجیب ہے کہ اپنی زندگی میں وہ اتنے مشہور اور مقبول نہیں تھے جتنے اِس زمانے میں ہیں۔ خود فرماتے ہیں ؎

ہوں ظہوری کے مقابل میں خفائی غالبؔ
میرے دعوے پہ یہ حجّت ہے کہ مشہور نہیں

زمانہ گزرا۔ علم پھیلا۔ لوگوں کا ذوق چمکا۔ ہمعصر شاعروں کی چشمک ختم ہوئی۔ اُن کی شاعری مقبول ہونے لگی۔ اب تو حال یہ ہے کہ جہاں بھی شعر و شاعری کا چرچا ہوتا ہے، غالب ہی غالب نظر آتے ہیں۔

مدرسہ ہو، کالج ہو، یونیورسٹی ہو، اُردو زبان کی کوئی انجمن ہو۔ اُس کے تعلیمی نصاب میں غالب کی نظم اور نثر ضرور شامل ہوتی ہے۔ اُستاد محنت اور دلچسپی سے پڑھاتے ہیں۔ اور طالب علم بڑے شوق سے پڑھتے ہیں۔

اِس زمانے میں ریڈیو گھر گھر عام ہے۔ اُن میں گیتوں، بھجنوں اور ہندی اُردو کی دوسری نظموں کے ساتھ غالب کی غزلیں بھی گائی جاتی ہیں۔ سب لوگ، کیا مرد کیا عورتیں، کیا لڑکے اور لڑکیاں ان غزلوں کو بڑے ہی چاؤ سے سنتے ہیں۔

اُن کے کلام میں شیرینی بھی ہے اور رنگینی بھی۔ وہ مشکل بھی ہے اور آسان بھی، اُس میں محبّت و الفت کے نغمے بھی ہیں اور غم و اندوہ کے نوحے بھی۔ اُن کے شعر ہمارے خیالات کو اُبھارتے ہیں، ہمارے جذبات کو جگاتے ہیں۔ ہمیں غور و فکر پر اُکساتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ اُن کے شعر اُنھیں کے نہیں ہمارے دل کی بھی آواز معلوم ہوتے ہیں۔

اب تک یوں تو درجنوں کتابیں، بیسیوں رسالے اور سینکڑوں مضمون اُن کی زندگی اور اُن کی نظم و نثر کے بارے میں چھپ چکے

ہیں۔ لیکن ابھی تک اس بات کی کوئی خاص کوشش نہیں ہوئی کہ بچّے
بھی بچپن ہی میں کسی نہ کسی حد تک اُن کی نظم اور نثر کی خوبیوں سے
واقف ہو جائیں۔ اور بڑے ہونے پر جب وہ مرزا صاحب کے کلام
کا گہرا مطالعہ کریں تو اُس سے پورا پورا لطف اُٹھا سکیں۔ اس لیے
اپنے شفیق اور محترم بزرگ جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب قبلہ
صدر جمہوریہ ہند کے ارشاد پر میں نے اُن کو بچّوں سے روشناس
کرنے کی جرأت کی ہے۔

ہر چند کہ یہ کام مشکل ہے پھر بھی کوشش کروں گا کہ آسان
زبان اور عام فہم انداز میں مرزا غالب کی کہانی بچّوں کو سناؤں۔
میں چاہتا ہوں کہ بچّے اُن کی نظم و نثر سے واقف ہوں۔ ان میں غور و فکر کی
عادت ہو، اُن کے دماغ میں اونچے خیالات آئیں۔ وہ بھی علم اور اخلاق میں آگے
بڑھنے کا حوصلہ کریں۔ اور نیک نامی کی اُس منزل پر پہنچ کر دم لیں۔ جہاں آدمی
واقعی انسان کہلانے کا حقدار ہوتا ہے۔ کیونکہ غالب ہی کے قول کے مطابق ؎

بس کہ دشوار ہے ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

بچوں کا دوست، محمد شفیع الدین نیّرؔ

۲ — مرزا غالب کون ہیں؟

پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے   کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا

اپنے مرتبے کے بارے میں اپنے آپ کچھ بتانا مشکل ہوتا ہے۔ مگر اُن کے لیے جو بات مشکل تھی وہ میرے لیے آسان ہے۔

آپ کا نام 'اسد اللہ بیگ خاں' تھا۔ مرزا لقب، 'نوشہ' عُرف، 'نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظامِ جنگ' خطاب، اور 'اسد' اور 'غالب' آپ کے تخلّص ہیں۔ زندگی میں اپنے عُرف مرزا نوشہ سے اور مرنے کے بعد مرزا غالب کے نام سے شہرت حاصل کی۔

غالب کا تعلق ایک نامور خاندان سے تھا۔ مگر باپ دادا کی ناموری سے آپ نے کچھ زیادہ فائدہ نہیں اٹھایا۔ ہاں بعض خاندانی خوبیاں مثلاً 'رکھ رکھاؤ'، 'عام ہمدردی'، اور 'بلند نظری' ایسی ہیں جن میں اُن کے خاندان کا عکس نظر آتا ہے۔

مرزا صاحب اپنا رشتہ ایران کے بادشاہ فریدون سے ملاتے ہیں اور ایک شعر میں اپنے آبائی پیشے سپہ گری کو شاعری پر فوقیت دیتے ہیں ؎

سو پشت سے ہے پیشۂ آباء سپہ گری
کچھ شاعری ذریعۂ عزّت نہیں مجھے

اُن کے بزرگوں کے ہندوستان آنے کا بھی ایک قصّہ ہے۔ ہوا یہ کہ اُن کے دادا مرزا قوقان بیگ خاں کسی بات پر اپنے والد سے بگڑے۔ اور اپنے وطن سے چل کر محمد شاہ بادشاہ کے عہد میں دہلی آ گئے، محمد شاہ نے وفات پائی۔ اُن کے جانشین، شاہ عالم کے زمانے میں مرزا قوقان بیگ خاں کا ستارہ چمکا۔ وہ پچاس سواروں کے افسر بن گئے۔ انھوں نے اپنی سوجھ بوجھ سے تھوڑے ہی عرصے میں اتنی ترقی کی کہ اُن کا شمار منصبداروں میں ہونے لگا۔ نقّارہ اور نشان کا حق مل گیا۔ نقّارہ اور نشان مغلیہ حکومت میں عزّت اور وقار کی علامت سمجھے جاتے تھے۔ مرزا قوقان بیگ خاں کی اولاد میں دو لڑکے مشہور ہوئے۔

ایک مرزا عبداللہ بیگ خاں مرزا غالب کے والد، دوسرے مرزا نصراللہ بیگ خاں اُن کے چچا۔

عبداللہ بیگ خاں جوان ہوئے تو اُن کی شادی آگرہ کے ایک خوش حال خاندان میں ہو گئی۔ ان کے خسر کا نام خواجہ غلام حسین تھا۔ اور اُن کی بیوی کا نام عزت النسار بیگم۔ عزت النسار بیگم ایک پڑھی لکھی خاتون تھیں۔ شادی کے بعد عبداللہ خاں اپنی سسرال ہی میں رہنے لگے۔ اُن کے خسر خواجہ غلام حسین کی مالی حالت بہت اچھی تھی۔ اس لیے جب تک یہ آگرہ میں رہے ان کی زندگی فراغت اور آرام سے بسر ہوتی رہی۔ وہیں اُن کے ہاں تین بچے ہوئے۔ ایک لڑکی، چھوٹی خانم ؛ دو لڑکے، بڑے مرزا اسداللہ بیگ خاں، چھوٹے مرزا یوسف بیگ خاں،

<u>پیدائش</u> | یہیں آگرہ میں ۲۷ دسمبر ۱۷۹۶ء مطابق ۱۲۱۲ھ کو مرزا صاحب پیدا ہوئے۔ اُن کی تاریخِ پیدائش کا ایک شاعرانہ لطیفہ قابلِ ذکر ہے۔

ضلع ایٹہ میں ایک قصبہ ہے مارہرہ۔ یہاں حضرت صاحب عالم ایک بزرگ مرزا غالب کے ایک دوست رہتے تھے۔ انھیں صاحب عالم نے مرزا غالب کو اپنی پیدائش کا ہجری سال لکھا ہے۔ اور غالب سے اُن کی پیدائش کا سال دریافت کیا ہے۔ حضرت صاحب عالم کی پیدائش کا ہجری سال لفظ "تاریخ" سے نکلتا ہے یعنی ۱۲۱۱ھ۔ مرزا صاحب نے اِس سوال کے جواب میں تحریر فرمایا کہ لفظ "تاریخ" پر ایک الف اور بڑھا دیا جائے۔ اِس حساب سے ۱۲۱۲ھ ہو جائیں گے۔ یہی میری پیدائش کا سال ہے۔ "تاریخ" سے "تاریخا" بنا کر اپنی ظرافت اور حاضر جوابی کیا خوب دکھائی ہے۔

ہاتفِ غیب شب کو یوں چیخا　　اُن کی "تاریخ" میرا "تاریخا"

۳۔ مرزا غالبؔ کا بچپن تعلیم اور تربیّت

مرزا غالب کی عمر ابھی پانچ ہی برس کی تھی کہ اُن کے والد اللہ کو پیارے ہو گئے۔ مرزا نصر اللہ بیگ خاں اُن کے چچا نے اِن کی سرپرستی کی۔ چچا کی شفقت نے باپ کی مفارقت کو بھلا دیا۔ نو برس کے ہوئے تھے کہ چچا نے بھی اس دنیا سے کوچ کیا۔ اُن کی وفات پر اُن کی جاگیر کے بدلے میں جو ماہوار رقم اُن کو مِل سکی اُس کی کُل مقدار ساڑھے باسٹھ روپے تھی۔

آپ کی والدہ اپنے میکے میں رہیں۔ اِس لیے آپ کا بچپن بڑے لاڈ پیار میں گزرا۔ اور تعلیم و تربیت بھی جیسی کہ امیر دل میں ہوتی ہے ہوتی رہی۔

اُس زمانے کے دستور کے مطابق مرزا صاحب نے مکتب میں

ناظرہ قرآن شریف، اور فارسی عربی کی چند درسی کتابیں پڑھیں۔
مولوی معظّم ایک اچھّے اُستاد تھے۔ اُن کی شاگردی میں آپ نے اتنی لیاقت حاصل کرلی کہ دس گیارہ برس کی عمر میں اُردو فارسی میں شعر کہنے لگے۔
گھر کے بیجا لاڈ پیار کا اُن کی جوانی کے ابتدائی زمانے پر کچھ اچھا اثر نہیں پڑا۔ وہ بُری صحبت میں پھنس گئے۔ کھیل کود میں اپنا وقت ضائع کرنے لگے۔ گنجفہ، شطرنج، چوسر میں لگا رہنا اور یار دوستوں کے ساتھ رات دن پھرنا اُن کا شغل ہوگیا۔ وہ تو یوں کہیئے کہ خدا کی مہربانی اور ان کی طبیعت کی نیکی تھی کہ سنبھل گئے۔ انھوں نے اپنی اِس زندگی پر آپ نظر ڈالی ہے اور اپنی ندامت کا اظہار اِس انداز میں کیا ہے کہ عبرت ہوتی ہے:
"مجھے علم اور فضل سے کام نہ تھا۔ اپنی بدنامی اور رُسوائی کی فکر نہ تھی۔ اوباشوں کی صحبت تھی اور آوارہ گردوں کی ہم رنگی۔ بُری راہوں پر چلتا تھا۔ اور بیہودہ باتوں اور

فضول کھیلوں میں اپنا وقت گنوانا تھا؟ مگر ؎

اُس کو بھولا نہ چاہئے کہنا   صبح جو جائے اور آئے شام

وہ بھلائی کی طرف مائل ہوئے۔ اپنے آپ کتابیں پڑھ پڑھ کر لیاقت بڑھائی۔ ایک نومسلم پارسی عبدالصمد کی صحبت سے بھی کافی فائدہ اٹھایا۔ آہستہ آہستہ ایسے ہو گئے جیسے کہ آج کل مشہور ہیں۔

۴ — شاعری کا شوق

مرزا صاحب کو بچپن ہی میں شعر گوئی کا شوق ہو گیا تھا۔ اُس زمانے کی یادگار اُن کی ایک مثنوی "پتنگ" پر ہے۔ یہ مثنوی آپ نے آٹھ نو برس کی عمر میں کہی تھی۔ اگر یہ سچ ہے تو اس کے پڑھنے سے مرزا صاحب کے بچپن کی لیاقت کا اندازہ ہو سکتا ہے:

ایک دن مثلِ پتنگِ کاغذی — لے کے دل سر رشتۂ آزادگی
خود بخود کچھ ہم سے کنیانے لگا — اِس قدر بگڑا کہ سر کھانے لگا
میں کہا اے دل، ہوائے دلبراں — بس کہ تیرے حق میں رکھتی ہے زباں
گو رے پنڈے پر نہ کر ان کے نظر — کھینچ لیتے ہیں یہ ڈورے ڈال کر
اب تو مل جائے گی ان سے تیری سانٹھ — لیکن آخر کو پڑے گی ایسی گانٹھ
سخت مشکل ہو گا سُلجھانا تجھے — قہر ہے دل ان سے اُلجھانا تجھے
یہ جو محفل میں بڑھاتے ہیں تجھے — بھول مت اِس پر اُڑاتے ہیں تجھے
ایک دن تجھ کو لڑا دیں گے کہیں — مفت میں ناحق کٹا دیں گے کہیں

دل نے سُنکر، کانپ کر، کھا پیچ و تاب　　غوطہ میں جا کر دیا کٹ کر جواب

"رشتۂ در گر دنم افگندہ دوست

می بر د ہر جا کہ خاطر خواہِ اوست"

اِس مثنوی میں بہت سے لفظ اور محاورے پتنگ کی رعایت سے آئے ہیں۔ فارسی شعر کسی اور شاعر کا ہے۔ اس نظم کی انگوٹھی میں اُسے نگینے کی طرح جڑنا آپ کی ابتدائی مشق کا کارنامہ ہے۔

شعر گوئی کی طرف اُن کی طبیعت ایسی مائل رہی کہ پچیس برس کی عمر میں پورا دیوان تیار ہو گیا۔ شروع میں انھوں نے مرزا عبدالقادر بیدل کی پیروی کی۔ ان کا کلام بہت مشکل ہوتا تھا۔ اِس لیے اُن کے طرز پر چلنے کے لیے انھیں کافی محنت کرنی پڑی۔ ؂

طرزِ بیدل میں ریختہ کہنا　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

اِس رنگ کو دیکھ کر میر تقی میرؔ جیسے شاعر نے اُن کے بارے میں یہ کہا تھا:۔

"اگر اِس لڑکے کو کوئی اُستادِ کامل مِل گیا۔ اور اُس نے سیدھے راستے پر ڈال دیا، تو لاجواب شاعر بن جائے گا۔ ورنہ مُہمَل

بکنے لگے گا۔"

مرزا صاحب نے اپنی خداداد طبیعت کو اپنا "اُستادِ کامل" بنایا۔ اپنی روش بدلی۔ کلام صاف اور سہل ہوتا گیا۔ پھر تو ایسا ہو گیا کہ اس پر یہ شعر صادق آنے لگا ؎

دیکھنا تقریر کی لذّت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے

۵ ــــ شادی خانہ آبادی

دہلی کی سکونت

مرزا غالب کی شادی نواب الٰہی بخش خاں معروفؔ کی صاحبزادی امراؤ بیگم سے ہوئی۔ شادی کے وقت اُن کی عمر تیرہ سال تھی اور اُن کی بیوی کی عمر گیارہ سال۔

دہلی کی سکونت | کچھ اِس رشتہ کی وجہ سے۔ کچھ دلّی کی دل لینے والی ادا کے سبب اُنھوں نے اِس شہر میں مستقل سکونت اختیار کر لی۔

اُن کے خسر حضرتِ معروفؔ ایک صوفی منش بزرگ اور خوش ذوق شاعر تھے۔ اُن کے ہاں رات دن شعر و سخن کا چرچا، اور عالموں اور شاعروں کی آمد و رفت تھی۔ مرزا صاحب پر بھی اِن صحبتوں کا اثر ضرور پڑا ہوگا۔

دلّی کی سکونت کا اثر ، مرزا صاحب کی شاعری پر

مرزا صاحب کا کلام بہت مشکل ہوتا تھا۔ اُن کے ہمعصر شاعر اِس کا مذاق اُڑاتے تھے۔ کبھی کبھی تو اُن کے کلام کو بے معنی بھی کہہ دیا کرتے تھے۔ اسی زمانے میں ایک دفعہ ایک دلچسپ واقعہ پیش آیا۔ مولوی عبدالقادر رامپوری ایک ظریف شاعر تھے۔ ایک روز انھوں نے کہا " مرزا صاحب! آپ کا ایک شعر میری سمجھ میں نہیں آرہا۔" اور اسی وقت یہ دو مصرعے موزوں کر کے پڑھ دیئے

پہلے تو روغنِ گُل بھینس کے انڈے سے نکال
پھر دوا جتنی ہو کل بھینس کے انڈے سے نکال

مرزا صاحب نے یہ شعر سُنا بہت گھبرائے۔ فرمایا: "خدا گواہ ہے! یہ شعر میرا نہیں ہے۔"

مولوی صاحب مُسکرا دیئے۔ گویا انھوں نے یہ بات جتائی کہ آپ کے شعر ایسے ہی ہوتے ہیں۔

مولوی محمد حسین آزاد نے اپنی مشہور کتاب "آبِ حیات" میں ایک اور واقعہ نقل کیا ہے: " ایک مشاعرے میں حکیم آغا جان عیش

نے اپنی غزل پڑھی۔ اور مرزا صاحب کو چڑانے کے لئے یہ دو شعر بھی اُس میں شامل کر دئے۔ ؎

اگر اپنا کہا تم آپ ہی سمجھے تو کیا سمجھے
مزا کہنے کا جب ہے اک کہے اور دوسرا سمجھے
کلامِ میرؔ سمجھے اور زبانِ میرزا سمجھے
مگر اپنا کہا تم آپ سمجھو یا خدا سمجھے

حالانکہ مرزا صاحب کا دعویٰ اپنے کلام کے بارے میں یہ تھا ؎

گنجینۂ معنی کا طلسم اُس کو سمجھئے ــــ جو لفظ کہ غالبؔ مرے اشعار میں آئے

مگر اوپر کا قطعہ سُن کر مرزا صاحب بس اتنا کہہ سکے ؎

نہ ستائش کی تمنّا نہ صلے کی پروا ــــ گر نہیں ہیں مرے اشعار میں معنی نہ سہی

آخر بعض بزرگوں کی صحبت اور بعض مخلص دوستوں کی فہمائش اور فرمائش پر اپنی پرانی روش ترک کر دی۔ پھر تو ان کا کلام ایسا ہو گیا کہ بہت سے شعر اپنی سادگی کی بنا پر سہلِ ممتنع میں شمار ہوتے ہیں۔ یعنی ایسے کہ اُن سے زیادہ سہل ممکن نہیں۔

۶۔ مرزا غالب کے خاص خاص سفر

مرزا صاحب نے ایک بار اپنی ذاتی ضرورت سے کلکتہ کا سفر کیا۔ راستے میں لکھنؤ، بنارس، باندہ اور پٹنہ وغیرہ میں رُکنا پڑا۔ لکھنؤ کے قیام کی یادگار اُن کے چند لطیفے یہاں درج کیے جاتے ہیں۔

کسی صحبت میں لکھنؤ اور دلّی کی زبان پر گفتگو ہو رہی تھی۔ ایک صاحب نے مرزا صاحب سے کہا: "جس موقع پر دلّی والے "اپنے تئیں" بولتے ہیں۔ اس موقع پر لکھنؤ والے "آپ کو" بولتے ہیں۔ آپ کے خیال میں فصیح "اپنے تئیں" ہے یا "آپ کو"؟

مرزا صاحب نے فرمایا کہ "فصیح تو یہی معلوم ہوتا ہے جو لکھنؤ والے بولتے ہیں۔ مگر اس میں ایک قباحت ہے۔ مثلاً آپ میرے بارے میں فرمائیں کہ میں آپ کو فرشتہ خصائل سمجھتا ہوں۔ اور میں اس کے جواب میں اپنی بابت عرض کروں کہ میں تو آپ کو

کُتّے سے بھی بدتر سمجھتا ہوں۔ تو سخت مشکل پیش آئے گی۔ میں تو اپنی نسبت کہوں گا۔ مگر آپ ممکن ہے اپنی نسبت سمجھیں۔"

زبان ہی کے بارے میں مرزا صاحب کا ایک اور لطیفہ بھی مشہور ہے۔ دِلّی والے رتھ آیا بھی بولتے ہیں اور رتھ آئی بھی۔ یعنی یہ لفظ مذکّر بھی استعمال ہوتا ہے اور مونث بھی۔ کسی نے مرزا صاحب سے پوچھا۔ "حضرت! رتھ مونّث ہے یا مذکّر ہے؟"

آپ نے کہا۔ "بھیّا! جب رتھ میں عورتیں بیٹھی ہوں تو مونّث اور جب مرد بیٹھے ہوں تو مذکّر سمجھو۔"

چند روز بنارس میں بھی ٹھیرے۔ اِس شہر کی دلکشی کچھ ایسی دلنشین ہوئی کہ تیس برس کے بعد اپنے ایک شاگرد، میاں داد خاں سیّاح کے خط میں اِس کا ذِکر کیا ہے:-

"بھائی! بنارس خوب شہر ہے۔ اور میرے پسند ہے۔ ایک مثنوی میں نے اِس کی تعریف میں لکھی ہے۔ اور "چراغِ دیر" اُس کا نام رکھّا ہے۔ میرے فارسی دیوان میں موجود ہے۔ اُس کو دیکھنا۔"

کلکتہ کے قیام کا اثر ضرور ہے کہ اُن کے خیالات اور شاعری

بھی پڑا ہو۔ اُس زمانے میں یہ شہر "سرکار انگریزی کمپنی" کا صدر مقام تھا۔ مرزا صاحب نے یہاں یورپ کی جدید زندگی کی نئی نئی چیزیں یعنی ریل، تار، دُخانی جہاز، اور دوسری سینکڑوں کلیں اور مشینیں دیکھیں اور مغربی تہذیب و ترقّی کا مشاہدہ کیا۔

اُنھوں نے یورپ کے مَردوں اور عورتوں کی آزاد زندگی بھی دیکھی حُسن اور نزاکت کی پتلیاں کلکتّہ کے بازاروں اور سیرگاہوں میں چلتی پھرتی نظر آئیں۔ دہلی واپس آنے کے بعد بھی مدّتوں اُس کی یاد اُن کے دل میں باقی رہی۔ اِس یاد کا اظہار انھوں نے ایک بڑے ہی دلکش قطعہ میں کیا ہے جس کا پہلا شعر یہ ہے ؎

کلکتّہ کا جو ذکر کیا تو نے ہمنشیں　　　اک تیر میرے سینے میں مارا کہ ہائے ہائے

یہیں ایک اور واقعہ پیش آیا۔ یہ دلچسپ واقعہ خود مرزا صاحب نے اِس طرح نقل کیا ہے۔

"میرا ایک قطعہ ہے کہ وہ میں نے کلکتّہ میں کہا تھا۔ تقریب یہ کہ مولوی کرم حسین، میرے ایک دوست تھے۔ انھوں نے ایک مجلس میں چکنی ڈلی بہت پاکیزہ اور بے رلشیہ اپنے کفِ دست پر

رکھ کر مجھ سے کہا۔ کہ اس پر کچھ تشبیہات نظم کیجئے۔ میں نے وہیں بیٹھے بیٹھے نو دس شعر کا ایک قطعہ اُن کو لکھ کر دے دیا اور صلے میں وہ ڈلی لے لی۔"

آپ بھی یہ قطعہ پڑھئے۔ اِس کا پہلا شعر یہ ہے۔ ؎

ہے جو صاحب کی کفِ دست پہ یہ چکنی ڈلی
زیب دیتا ہے اِسے جس قدر اچّھا کہئے

مرزا صاحب دو بار رام پور بھی گئے۔ اِس کے علاوہ آپ کو میرٹھ اور مراد آباد وغیرہ بھی جانا پڑا۔ ان کا ذکر اُن کے کئی بہت ہی دلچسپ خطوں میں ملتا ہے۔

۷۔ مرزا غالب کی قلعۂ معلّٰی سے وابستگی

مرزا صاحب کی شاعری ترقی کرتی اور اُن کی شہرت بڑھتی رہی۔ قلعہ میں جو مشاعرے ہوتے۔ مرزا غالب اُن میں شرکت فرماتے۔ اپنا کلام سناتے۔ داد پاتے۔ لیکن قلعہ معلّٰی سے اُن کا خاص تعلق ۱۸۵۰ء میں قائم ہوا۔ اِس طرح کہ بادشاہ بہادر شاہ ظفرؔ نے مرزا صاحب کو حکم دیا کہ وہ تاریخِ تیموریہ لکھیں۔ پچاس روپیہ ماہوار اِس خدمت کا وظیفہ مقرّر ہوا۔ مرزا صاحب کو تاریخ کے علم سے کوئی خاص لگاؤ نہیں تھا۔ اِس لئے یہ بات طے پائی کہ حکیم احسن اللہ خاں مختلف کتابوں سے تاریخی مواد مہیّا کریں۔ اور مرزا صاحب اپنی فصیح و بلیغ فارسی زبان اور اپنے خاص دلچسپ اور دلکش انداز میں ان حالات اور واقعات کو کتابی صورت میں لکھتے اور ترتیب دیتے رہیں۔ اسی خدمت کی سپردگی پر غالب نے کہا تھا ؎

غالبؔ وظیفہ خوار ہو، دو شاہ کو دعا   وہ دِن گئے کہ کہتے تھے نوکر نہیں ہوں میں

اِسی موقع پر بادشاہ نے نجم الدولہ، دبیر الملک اور نظامِ جنگ کے خطابات سے نوازا۔ اور چھ پارچوں کا خلعت معہ تین زیور یعنی جیغہ، سرپیچ اور مالائے مروارید دربار عام میں مرحمت فرمایا۔

آپ نے تاریخِ تیموریہ کی یہ کتاب "پرتوستان" کے نام سے لکھنی تجویز کی۔ اِس کے دو حِصّے قرار دئے۔ پہلے حصّے کا نام "مہرِ نیمروز" رکھّا اور دوسرے حصّے کا نام "ماہِ نیم ماہ"۔ پہلا حصّہ پورا ہوگیا۔ دوسرا حِصّہ شروع ہونے والا تھا کہ مغلیہ حکومت ہی کا تختہ اُلٹ گیا۔ اور "ماہِ نیم ماہ" کا نام ہی نام باقی رہ گیا۔

اسی زمانے میں بادشاہ کی چہیتی بیگم نوّاب زینت محل کے فرزند مرزا جوان بخت کی شادی ہوئی۔ بیگم کے حُکم پر مرزا صاحب نے شہزادے کا سہرا لکھا۔ اِس کا مطلع یعنی پہلا شعر یہ ہے ؎

خوش ہو اے بخت! کہ ہے آج ترے سر سہرا
باندھ شہزادہ جواں بخت کے سر پہ سہرا

اس کا مقطع یعنی آخری شعر یہ ہے ؎

ہم سخن فہم ہیں، غالب کے طرفدار نہیں
دیکھیں کہہ دے کوئی اِس سہرے سے بڑھ کر سہرا

یہ مقطع بادشاہ کو ناگوار ہوا۔ اِس شعر کو انھوں نے اپنی ذات پر طنز خیال کیا۔ اُن کے دل میں یہ بات آئی کہ "اِس زمانے میں اِس سے بڑھ کر سہرا کہنے والا کوئی اور شاعر نہیں ہے۔ ہم نے جو شیخ محمد ابراہیم ذوقؔ کو اپنا اُستاد بنا رکھا ہے۔ یہ بات سخن فہمی سے بعید ہے۔"

حضرت ذوقؔ حاضر ہوئے تو یہ سہرا بادشاہ نے انھیں دکھایا۔ انھوں نے پڑھ کر عرض کیا "پیر و مرشد! درست!"

بادشاہ نے فرمایا "اُستاد! تم بھی ایک سہرا لکھ دو۔" عرض کیا "بہت خوب!" فرمایا "مقطع کا بھی خیال رہے۔" عرض کیا "ایسا ہی ہوگا۔"

ذوقؔ قلم دوات اور کاغذ لے کر وہیں بیٹھ گئے اور اسی وقت سہرا لکھ ڈالا، اِس کا مطلع یہ ہے ؎

اے جواں بخت! مبارک ترے سر پر سہرا
آج ہے یُمن و سعادت کا ترے سر سہرا

اِس سہرے کا آخری شعر یوں سمجھئے کہ مرزا غالب کے سہرے کا جواب ہے ؎

جن کو دعویٰ ہو سخن کا یہ سُنا دو اُن کو
دیکھو، اِس طرح سے کہتے ہیں سخنور سہرا

اِس سہرے کی شہرت شہر بھر میں پھیل گئی۔ مرزا صاحب آدا شناس تھے۔ بادشاہ کی بدگمانی کو تاڑ گئے۔ اُن کا مدّعا بادشاہ پر طنز اور حضرت ذوقؔ کی دل آزاری نہ تھا۔ پھر بھی بدگمانی کو دور کرنے کے لئے انھوں نے "قطعۂ معذرت" پیش کیا ؎

منظور ہے گزارشِ احوالِ واقعی
اپنا بیانِ حُسنِ طبیعت نہیں مجھے

چند شعر کے بعد ؎

اُستادِ شہ سے ہو مجھے پرخاش کا خیال
یہ تاب، یہ مجال، یہ طاقت نہیں مجھے

اِس سے زیادہ وضاحت اور کیا ہوگی ؎

رُوئے سخن کسی کی طرف ہو تو رُو سیاہ
سودا نہیں، جنوں نہیں، وحشت نہیں مجھے

آخری شعر ہے ؎

صادق ہوں اپنے قول کا غالبؔ خدا گواہ
کہتا ہوں سچ کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے

بادشاہ کا دل صاف ہوگیا۔ بات آئی گئی ہوئی۔

اسی زمانے کے چند لطیفے مشہور ہیں۔

مرزا غالب بادشاہی آداب کا لحاظ رکھتے ہوئے بھی شاہی خدمت میں خاصے بے تکلّف تھے۔

رمضان شریف کے بعد عید کے موقع پر مرزا صاحب دربار میں حاضر ہوئے۔ بادشاہ نے دریافت کیا "مرزا۔ تم نے رمضان شریف میں کتنے روزے رکھّے۔؟" مرزا صاحب نے فوراً جواب دیا۔ "پیر و مرشد! ایک نہیں رکھّا"

آموں کی فصل تھی۔ ایک روز قلعہ کے خاص باغ میں بادشاہ ٹہل رہے تھے۔ مرزا صاحب بھی ساتھ تھے۔ اِس باغ کے آم بادشاہ، بیگمات اور شہزادے شہزادیوں کے سوا کسی اور کو نہیں مِل سکتے تھے۔ آموں کی شاخیں اور ٹہنیاں کچّے پکّے آموں سے بڑی جھول رہی تھیں۔ مرزا صاحب اُن کی طرف

بار بار تک رہے تھے۔ بادشاہ نے پوچھا۔ "مرزا! اِس غور سے کیا دیکھ رہے ہو؟"

آپ نے ہاتھ باندھ کر عرض کیا۔ "پیر و مرشد! دانے دانے پر مہر ہوتی ہے۔ دیکھ رہا ہوں کہ آم کے کسی دانے پر میرے نام کی بھی مہر ہے؟" بادشاہ یہ سُن کر مسکرائے۔ اور اُسی دن ایک بہنگی آم مرزا صاحب کے ہاں بھجوا دئے۔

۸۔ قلعۂ معلّٰی کی خوشگوار یادیں

قلعہ کے اِس تعلق کی بعض یادیں بڑی خوشگوار ہیں۔ قلعہ میں ملازموں کو چھٹے مہینے تنخواہ ملتی تھی۔ مرزا صاحب خرچ سے تنگ رہا کرتے تھے۔ انھیں اتنی مدّت میں تنخواہ ملنی ناگوار تھی۔ اِس لئے "گزارش بحضورِ شاہ" کے عنوان سے ایک قطعہ بادشاہ کی خدمت میں پیش کیا۔ اِس کے چند شعر آپ بھی سُنئے:۔

اے شہنشاہِ آسماں اورنگ ۔۔۔ اے جہاندارِ آسماں آثار
نہ کہوں آپ سے تو کس سے کہوں ۔۔۔ مدعائے ضروری الاظہار
مری تنخواہ جو مقرّر ہے ۔۔۔ اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار
رسم ہے مردے کی چھ ماہی ایک ۔۔۔ خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار
مجھ کو دیکھو تو ہوں بقیدِ حیات ۔۔۔ اور چھ ماہی ہو سال میں دوبار
مری تنخواہ کیجے ماہ بماہ ۔۔۔ تا نہ ہو مجھ کو زندگی دشوار

تم سلامت رہو ہزار برس

ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار

اِس قطعہ سے مرزا صاحب کی ظرافت اور اپنے مدعا کو پُر اثر بنانے کی قدرت کا اظہار ہوتا ہے۔

اسی زمانے میں مرزا صاحب نے اپنی ایک نئی غزل دربار میں پڑھی۔ جس کا مطلع ہے ؎

یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا

اگر اور جیتے رہتے یہی انتظار ہوتا

غزل پسند کی گئی۔ واہ واہ کے شور سے دیوانِ عام کے در و دیوار گونج اُٹھے۔ جب غزل کا یہ مقطع پڑھا ؎

یہ مسائلِ تصوف یہ ترا بیان غالبؔ

تجھے ہم ولی سمجھتے جو نہ بادہ خوار ہوتا

بادشاہ نے فرمایا۔ "بھئی! ہم تو اُس وقت بھی ولی نہ سمجھتے"۔ مرزا صاحب نے ہاتھ باندھ کر بے ساختہ عرض کیا۔ "حضور تو اب بھی مجھے ایسا ہی سمجھتے ہیں، مگر اظہار اِس لئے نہیں فرماتے

کہیں اپنی ولایت پر کہیں مغرور نہ ہو جاؤں "
آزادی کی پہلی جنگ یعنی ۱۸۵۷ء سے چار سال قبل
حضرت ذوقؔ نے وفات پائی۔ اب بادشاہ کے کلام کی اصلاح
بھی مرزا غالبؔ سے متعلق ہو گئی۔ اِس تعلق سے آپ کی شہرت،
عزت اور اثر کا دائرہ بھی وسیع ہو گیا۔

مغلیہ حکومت کا خاتمہ،

مرزا صاحب کی پریشانیاں

قلعۂ معلّٰی سے طویل تعلق، سات سال تک تاریخ نویسی کی خدمت، تین چار برس بادشاہ کی اُستادی کا شرف، آزادی کی پہلی جنگ کی ناکامی کے بعد ختم ہوا۔ مغلیہ حکومت کی بساط اُلٹ گئی۔ نہ قلعہ کی ملازمت رہی۔ نہ مشاعرے۔ نہ قلعہ کی رنگارنگ زندگی۔ ع

آں قدح بشکست و آں ساقی نہ ماند۔

دلی کا تخت لُٹ گیا، سینکڑوں بے گناہ پھانسی کے تختے پر لٹکائے گئے۔ ع

جسے دیکھا حاکمِ وقت نے کہا یہ بھی قابلِ دار ہے

ہزاروں گھر سے بے گھر ہوئے۔ اور ہزاروں شہر بدر۔ اِس پکڑ دھکڑ اور آپا دھاپی میں۔ میں کہاں تو کہاں۔ جس کے

جدھر سینگ سمائے چلتا بنا۔

کتنے دوست تھے مرزا غالب کے جو اُن سے جُدا ہوئے، کتنے عزیز تھے جو دوسری دُنیا کو سدھارے۔ مفلسی میں آٹا گیلا۔ قلعہ کا وظیفہ ختم۔ انگریزی سرکار سے ملنے والی پنشن بند۔ آمدنی کا کوئی ظاہری ذریعہ نہ رہا۔ مرزا صاحب پر یہ بپتا پڑی کہ گھر کا سامان، یہاں تک کہ برتن بھانڈے اور کپڑے لتّے تک بیچ بیچ کر گزارہ کرنا پڑا۔

اسی دوران میں رامپور کے نوّاب یوسف علی خاں ناظم شعرو شاعری میں مرزا صاحب کے شاگرد ہوئے۔ انھوں نے سو روپیہ ماہوار ان کا وظیفہ مقرر کر دیا۔ یہ وظیفہ نواب صاحب کی وفات کے بعد اُن کے جانشین نواب کلب علی خاں کی سرکار سے بھی مرزا صاحب کو مرتے دم تک ملتا رہا۔ تین برس کے بعد پنشن بھی جاری ہو گئی۔ کچھ آمدنی اِدھر اُدھر سے ہوتی رہی۔ غرض اُن کی گزر بسر کا سامان ہو گیا۔ پھر بھی وہ خوشحالی اور فراغت انھیں کبھی میسّر نہیں آئی جو اپنے کمال کی بنا پر اُن کا حق تھا۔ ذوق ؎

پھرتے ہیں اہلِ کمال آشفتہ حال افسوس ہے ۔۔۔ اے کمال افسوس ہے، تجھ پر کمال افسوس ہے

مرزا صاحب کو دوبارہ رامپور بھی جانا پڑا۔ وہاں رہے تو سو روپیہ ماہوار دعوت کے نام سے اور ملے۔ اِس لالچ سے بھی انھوں نے وہاں مستقل قیام کی پابندی گوارا نہیں کی۔ اِس زمانے کے بعض خط بڑے مزیدار ہیں۔ یہ خط آپ مرزا صاحب کی نثر نگاری کے بیان میں پڑھیئے۔ ہاں ایک لطیفہ یہاں بھی سُن لیجئے۔ ہوا یہ کہ نواب کلب علی خاں اپنی ریاست کے دورے پر رامپور سے کہیں باہر جارہے تھے۔ مرزا صاحب بھی سواری تک پہنچانے کے لئے اُن کے ساتھ آئے۔ نوّاب صاحب سوار ہونے لگے تو حاضرین کے ساتھ آپ نے بھی آداب اور کورنش ادا کی۔ نواب صاحب نے آپ کے آداب پر مسکراتے ہوئے فرمایا۔ "خدا حافظ!" مرزا غالب کو شوخی نے گُدگُدایا۔ قدرے غمگین صورت بنا کر بولے۔ "حضرت! خدا نے تو مجھے آپ کے سپرد کیا ہے۔ اب آپ پھر اُلٹا مجھے خدا کے سپرد کرتے ہیں!"

۱۰۔ بیماریاں۔ بڑھاپا۔ اور وفات

مرزا غالب کی زندگی کا کاروان اپنی منزلیں طے کرتا رہا۔ شاعری کی شہرت بڑھتی رہی۔ شاگردوں کی کثرت ہوئی۔ کلام شائع ہوا۔ خط اکٹھے کئے گئے۔ غرض "خوش و ناخوش" بہ مدّت بہرحال گزر ہی گئی۔ آخر بڑھاپے نے اپنی کمند مرزا صاحب پر پھینکی۔ اور بیماریوں کے پھندوں نے اُن کا جوڑ جوڑ جکڑ لیا۔ سودا سے

ضعف و ناطاقتی و سُستی و اعضا شکنی
ایک گھٹنے سے جوانی کے بڑھا کیا کیا کچھ

کیا کیا بیماریاں اٹھائیں۔ کیسے کیسے دکھ جھیلے، کتنی شدید تکلیفیں برداشت کیں۔ اس کا ٹھیک اندازہ اُن خطوں سے ہو گا۔ جو آپ نے اپنے دوستوں اور شاگردوں کو لکھے ہیں۔

"حکیم سیّد احمد حسن صاحب مودودی کو لکھتے ہیں:۔
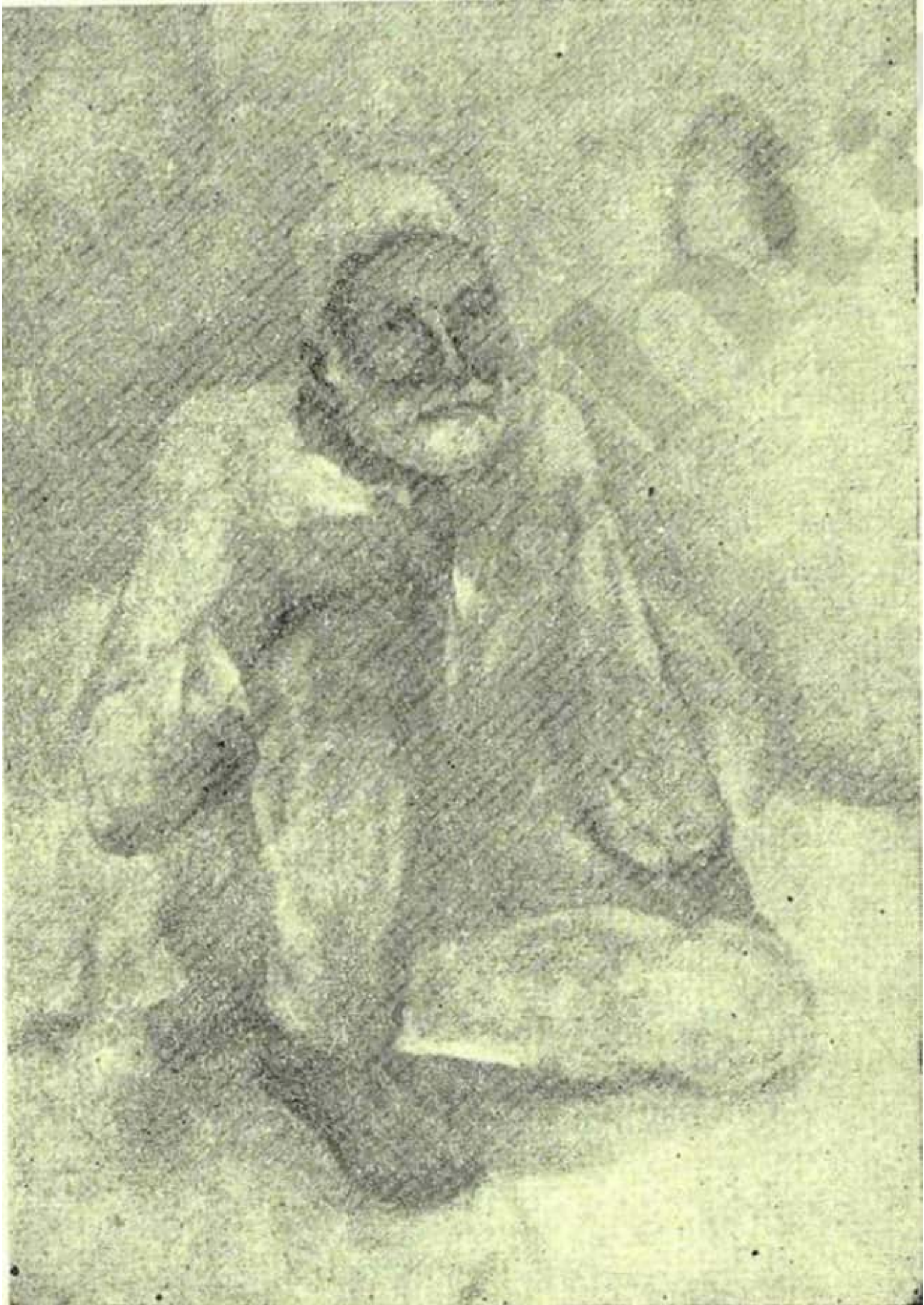
"پیر و مرشد! آپ کو میرے حال کی بھی خبر ہے۔ ضعف نہایت کو پہنچ گیا۔ رعشہ پیدا ہو گیا۔ بینائی میں فتور پڑا۔ حواس مختل ہو گئے۔ جہاں تک ہو سکا احباب کی خدمت بجا لایا۔ اوراقِ اشعار لیٹے لیٹے دیکھتا تھا۔ اب نہ آنکھوں سے اچھی طرح سوجھے نہ ہاتھ سے اچھی طرح لکھا جائے۔ کہتے ہیں کہ شاہ بو علی قلندر کو بسببِ کبر سن خدائے تعالیٰ نے فرض اور پیمبر نے سنّت معاف کر دی تھی۔ میں متوقع ہوں کہ میرے دوست خدمتِ اصلاحِ اشعار مجھ پر معاف کریں۔ خطوطِ شوقیہ کا جواب جس صورت سے ہو گا لکھ دیا کروں گا۔"

انھیں حکیم صاحب کو ایک اور خط لکھوایا ہے۔

"سیّد صاحب قبلہ حکیم سیّد احمد حسن صاحب کو غالبِ نیم جان کا سلام پہنچے۔ وہ جو آپ نے سنا ہے کہ غالب کو اب افاقت ہے۔ سو محض غلط ہے۔ آگے ناتوان تھا۔ اب نیم جان ہوں۔ خط نہیں لکھ سکتا۔ ایک لڑکے سے یہ چند سطریں لکھوا دی ہیں۔ جو میں کہتا گیا ہوں وہ غریب لکھتا گیا ہے۔ آپ سیّد اور بزرگ

ہیں میرے حق میں دعا کریں کہ اب تہتّر برس سے آگے نہ بڑھوں۔ اور اگر کچھ زندگی اور ہے تو حق تعالیٰ تھوڑی صحّت اور طاقت عنایت کرے۔ تاکہ دوستوں کی خدمت بجالاتا رہوں۔"

ایک اور خط پڑھئے۔ یہ خط آپ نے نوّاب انوارالدّولہ بہادر شفق کو لکھا تھا۔ حضرت شفقؔ نے کسی سے سُنا تھا کہ غالبؔ کا انتقال ہوگیا۔ اس کا ذکر انھوں نے اپنے خط میں بھی کر دیا۔ مرزا صاحب نے یہ مکتوب اُن کے اسی خط کے جواب میں لکھا ہے۔ خط کی عبارت سے اُن کی بیماری اور ضعف کا نقشہ آنکھوں میں پھر جاتا ہے۔ اِس غم نامے کو بھی مرزا صاحب نے اپنی شوخ طبعی سے ایک افسانہ بنا دیا ہے جِسے بار بار پڑھ کر بھی جی نہیں بھرتا۔

"خداوندِ نعمت! آج دوشنبہ ۷ رمضان کی اور ۱۵ فروری کی ہے۔ اِس وقت کہ بارہ پر تین بجے ہیں عطوفت نامہ پہنچا۔ ادھر پڑھا اِدھر جواب لکھّا۔ ڈاک کا وقت نہ رہا خط کو معنون رکھتا ہوں۔ کل سہ شنبہ ۱۶ فروری کو ڈاک میں بھیجوا دوں گا۔ سالِ گزشتہ مجھ پر بہت سخت گزرا۔ بارہ تیرہ مہینے صاحبِ فراش

رہا۔ اُٹھنا دشوار تھا۔ چلنا پھرنا کیسا۔ نہ تپ نہ اِسہال، نہ فالج نہ لقوہ، ان سب سے بدتر ایک صورت پُرکدورت یعنی احتراق کا مرض مختصر یہ ہے کہ سر سے پاؤں تک بارہ پھوڑے۔ ہر پھوڑا ایک زخم۔ اور ہر زخم ایک غار۔ ہر روز بے مبالغہ تیرہ پھائے، اور پاؤ بھر مرہم درکار۔ نو دس مہینے بے خور و خواب رہا ہوں۔ اور شب و روز بیتاب، راتیں یوں گزری ہیں کہ اگر کبھی آنکھ لگ گئی تو گھڑی بھر غافل رہا ہوں گا کہ ایک آدھ پھوڑے میں ٹیس اٹھی جاگ اُٹھا۔ تڑپا کیا۔ سو گیا۔ پھر ہوشیار ہو گیا۔

سال بھر میں تین حِصّے یوں گزرے۔ پھر تخفیف ہونے لگی۔ دو تین مہینے میں لوٹ پیٹ کر اچّھا ہو گیا۔ نئے سرے سے روح قالب میں آئی۔ اجل نے میری سخت جانی کی قسم کھائی۔ اب اگرچہ تندرست ہوں۔ لیکن ناتواں اور سُست ہوں۔ حواس کھو بیٹھا۔ حافظہ کو رو بیٹھا۔ اگر اُٹھتا ہوں تو اتنی دیر میں اُٹھتا ہوں جتنی دیر میں ایک قدِّ آدم دیوار اُٹھے۔

آپ کی پُرسِش کے قربان۔ کہ جب تک میرا مرنا نہ سُنا۔

میری خبر نہ لی۔ میری مرگ ادر مخبر کی تقریر ادر مثلہِ میری تحریر، آدھی سچ آدھی جھوٹ۔

"در صورتِ مرگ نیم مردہ اور در حالتِ حیات نیم زندہ ہوں"

اِن بیماریوں اور پریشانیوں کے باوجود اُن کے مزاج کی شوخی مرتے دم تک باقی رہی۔

ایک دفعہ شہر میں سخت وبا پھیلی۔ میر مہدی حسن مجروح اُن کے چہیتے شاگرد نے دریافت کیا۔ "حضرت! وبا شہر سے دفع ہوئی یا ابھی موجود ہے؟" اِس کے جواب میں لکھتے ہیں۔ "بھئی! کیسی وبا۔ جب ایک ستّر برس کے بوڑھے اور ستّر برس کی بڑھیا کو نہ مار سکے۔ تو تُف بریں وبا!"

ظرافت اور شوخی کے باوجود اُن کے خطوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اِس دکھ بھری زندگی سے تنگ آگئے تھے۔ اور مرنے کے دل سے خواہاں تھے۔ خواجہ حالیؔ نے اُن کی آخری عمر کا حال "یادگارِ غالب" میں اِس طرح بیان کیا ہے۔

"مرنے سے کئی برس پہلے چلنا پھرنا بند ہو گیا تھا۔ زیادہ تر

پلنگ پر پڑے رہتے تھے۔ غذا کچھ نہ رہی تھی۔ طشت و چوکی پاس ہی کسی قدر ادھل میں لگی رہتی تھی۔ جب حاجت ہوتی۔ پردہ ہو جاتا۔ آپ بغیر نوکر چاکر کے کپڑے اُتار کر بیٹھے ہی بیٹھے، کھسکتے کھسکتے چوکی پر پہنچتے۔ پلنگ پر سے چوکی تک جانا۔ چوکی پر دیر تک بیٹھے رہنا۔ اور پھر چوکی سے اُتر کر پلنگ تک آنا۔ کٹھن منزل طے کرنے کے برابر تھا۔ مگر خطوں کا جواب دینا اِس حالت میں بھی برابر جاری تھا۔ پلنگ پر پڑے پڑے خود لکھتے تھے۔ یا کسی دوسرے آدمی کو بتاتے جاتے تھے۔ وہ لکھتا جاتا تھا"

"مرنے سے چند روز پہلے بیہوش ہو گئے۔ پہر پہر دو دو پہر کے بعد چند منٹ کے لئے افاقہ ہو جاتا تھا"

یہی حال تھا کہ ایک روز خواجہ صاحب اُن کی عیادت کو گئے۔ اُسی وقت کئی پہر کے بعد قدرے افاقہ ہوا تھا۔ اور وہ نواب علاء الدین خاں کے نام جنھوں نے آپ کا حال دریافت کیا تھا۔ اپنا آخری خط لکھوا رہے تھے۔ اُس میں یہ ایک ہی فقرہ تھا۔

"میرا حال مجھ سے کیا پوچھتے ہو۔ ایک آدھ روز میں ہمسایوں سے پوچھنا۔" مرنے سے پہلے یہ شعر بار بار زبان پر آتا تھا ؎

دمِ واپسیں بر سرِ راہ ہے عزیزو! اب اللہ ہی اللہ ہے

۱۵ر فروری ۱۸۶۹ء کو تہتّر برس چار مہینے کی عمر میں مرزا صاحب نے اِس دُنیا سے کوچ فرمایا۔ حضرت نظام الدین اولیارؒ کی درگاہ کے باہر جنوب مشرق کی طرف اپنے خسر نواب الٰہی بخش خاں معرؔوف کے مزار کے قریب دفن کئے گئے۔

مرزا غالب کے ارادتمندوں نے چند سال ہوئے اُن کے مزار پر سنگِ مرمر کی ایک مختصر سی خوش نما عمارت بنوا دی ہے مزار کے سرہانے سنگِ مرمر کی لوح پر مولانا حالؔی کا یہ شعر کندہ ہے ؎

رشکِ عُرفی و فخرِ طالب مُرد
اسداللہ خان غالبؔ مُرد

اِس کے نیچے میر مہدی مجروؔح کا کہا ہوا تاریخِ وفات کا یہ قطعہ ہے :۔

کل میں غم و اندوہ میں، با خاطرِ محزوں
تھا تُربتِ اُستاد پہ بیٹھا ہوا نمناک
دیکھا جو مجھے فکر میں تاریخ کی مجروح
ہاتف نے کہا: "گنجِ معانی ہے تہِ خاک"

دوسرا باب

۱۔ مرزا غالب کی شاعری

کسی زبان کی ایسی تحریریں جنھیں پڑھ کر ہمارا دل جھوم اُٹھے ادب کہلاتی ہیں۔ ان میں خیال کی رفعت، جذبے کی صداقت، زبان کی لطافت اور اندازِ بیان کی ندرت و نزاکت انھیں ادب کا درجہ بخشتی ہیں۔

ادب میں نظم اور نثر دونوں شامل ہیں۔ دلکش اور پُر تاثیر نظم ہی کا نام شاعری ہے۔

کوئی واقعہ پیش آتا ہے تو انسان اُس سے متاثّر ہوتا ہے۔ غم کی حالت میں صدمہ ہوتا ہے۔ خوشی کی حالت میں سرور ملتا ہے۔ کسی عجیب بات پر حیرت ہوتی ہے۔ کسی نازیبا حرکت پر غصّہ آتا ہے۔ غرض غم، خوشی، حیرت، غصّہ، نفرت، محبّت اور ہمدردی یہی جذبے احساس کہلاتے ہیں۔

واقعات سے ہر شخص اثر لیتا ہے۔ جذبات ہر شخص کے دل میں پیدا ہوتے ہیں۔ ہر شخص ان کا اظہار بھی کرتا ہے۔ لیکن محض اِس بنا پر ہم ہر شخص کو شاعر نہیں کہہ سکتے۔ شاعر کا احساس قوی ہوتا ہے۔ اُس کے سینے میں ایسا دل ہونا چاہیے جو موم کی طرح پگھلنے کی خاصیّت رکھتا ہو۔

حسنِ فروغِ شمع سخن دور ہے اسدؔ
پہلے دلِ گداختہ پیدا کرے کوئی

شاعر جو دیکھتا یا سُنتا ہے اُس کا اثر عام لوگوں کے مقابلے میں زیادہ قبول کرتا ہے۔ وہ کسی واقعہ یا منظر سے متاثّر ہی نہیں ہوتا بلکہ اپنی خیالی قوت سے کام لے کر اُس کے حسن اور اثر میں اضافہ بھی کرتا ہے۔ وہ اپنا ہی نہیں دوسرے دل کا دکھ درد بھی محسوس کرتا ہے۔ اُس کی آنکھ ہر چیز میں حسن اور سچّائی تلاش کر لیتی ہے۔ وہ اِس حسن اور سچائی کو حسین اور موزوں لفظوں میں بیان کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اِس طرح وہ حسن اور سچّائی زیادہ وضاحت اور آب و تاب کے ساتھ جلوہ دکھاتی ہے۔ اور ہم

اُس سے زیادہ لُطف اُٹھاتے اور اثر قبول کرتے ہیں۔

شاعری ایک فطری ملکہ ہے۔ یہ ملکہ پیدائشی ہوتا ہے، فطرت ہی کی رہنمائی میں اِس کی جِلا ہوتی رہتی ہے ؂

آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

شاعری کی ایک ضروری شرط بیان کے انداز کی جدّت اور دل آویزی ہے۔ شاعر کسی معمولی بات کو بھی ایسے انداز سے ادا کرتا ہے کہ سب لطف اٹھاتے اور وجد کرنے لگتے ہیں۔

اردو شاعری میں زیادہ تر حسن اور عشق کے خیالات ملتے ہیں ہمارے شاعر عام طور پر اسی لکیر کے فقیر رہے ہیں گویا کوئی اور روش اختیار کرنا اُن کی قدرت سے باہر تھا۔ مولانا محمد حسین آزادؔ دہلوی نے ٹھیک فرمایا ہے۔ "یہ لوگ دوسرے کے چبائے ہوئے نوالوں کے چبانے کے عادی ہیں۔ دیوان پر دیوان پڑھتے جائیے شاید ہی نظر کسی نُدرت یا جدّت سے دوچار ہو۔ خیالات اور طرزِ ادا کی یکسانیّت دل کو مکدّر کر دیتی ہے

برعکس اِس کے، مرزا غالب عام روش پر چلنے سے کتراتے تھے۔ وہ نئے خیالات نرالے رنگ میں ظاہر کرنا پسند کرتے تھے۔ خود فرماتے ہیں ؎

ہیں اور بھی دنیا میں سخنور بہت اچھّے
کہتے ہیں کہ غالبؔ کا ہے اندازِ بیاں اور

غالب عامیانہ خیالات اور محاورات سے بچتے تھے۔ جدّت اور خیال آفرینی اُن کی شاعری کی امتیازی خصوصیّت ہے۔ اِس لحاظ سے دیکھیں تو دنیا کے بڑے بڑے شاعروں کی صف میں وہ نمایاں نظر آتے ہیں۔

مواد اور صورت کے اعتبار سے اردو شاعری مختلف قسموں میں تقسیم ہے۔ غزل، قصیدہ، مثنوی، رباعی وغیرہ۔ مرزا صاحب نے ہر صنف میں کچھ نہ کچھ کہا ہے اور بہت خوب کہا ہے۔ البتّہ آپ کی توجہ کا خاص مرکز غزل رہی ہے۔

غزل کے معنی نوجوان عورتوں سے باتیں کرنے کے ہیں۔ شاعری میں غزل چند ایسے شعروں کے مجموعے کا نام ہے جس میں

زیادہ تر حسن و عشق، ہجر و وصال، اور حسرت و یاس کے مضمون بیان کئے جاتے ہیں۔ اس زمانے میں غزل کے دائرے میں مذہب، اخلاق، سیاست، حب الوطنی، واقعہ نگاری اور منظر کشی سبھی کچھ شامل ہیں۔

غزل کے ہر شعر کا مطلب اپنی جگہ الگ اور پورا ہوتا ہے۔ اس کا پہلا شعر مطلع کہلاتا ہے اور آخری شعر مقطع۔ مقطع میں عام طور پر شاعر اپنا تخلّص بھی نظم کرتے ہیں۔ مطلع کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوتے ہیں۔ قافیوں کے ساتھ ایک یا چند لفظ ہر شعر میں بار بار لاتے ہیں۔ یہ ردیف کہلاتے ہیں۔ قافیہ اور ردیف سے ترنّم میں مدد ملتی ہے۔ یہ ہے خاکہ اردو غزل کا۔

مرزا غالب کی غزلیں مختصر ہوتی ہیں۔ مگر ہوتی بڑی پر معنی ہیں۔ بقول محمد یحییٰ تنہاؔ۔ "وہ بات میں سے بات پیدا کرتا ہے۔ اور طرزِ ادا میں ایسی جدّت ہوتی ہے کہ معمولی بات بھی دلکش ہو جاتی ہے۔ اور نئی بات معلوم ہونے لگتی ہے"

مرزا صاحب کی غزلیں سب پہلوؤں پر حاوی نظر آتی ہیں۔

بیان کے انداز کی خوبی کا کیا کہنا۔ خواجہ حالی کا یہ شعر اس پر صادق آتا ہے ؎

لاکھ مضمون اور اُس کا ایک ٹھٹھول
سو تکلف اور اس کی سیدھی بات

مرزا غالب نے جو شہرت اِس زمانے میں پائی ہے اور ملک نے جس طرح سر آنکھوں پر اُن کے کلام کو جگہ دی ہے ظاہر ہے۔ اِس دَور کے ایک بڑے ہی نامور اور مقبول شاعر اقبال مرحوم نے جو نئی شاعری کے ساتھ پُرانی شاعری کا بھی اعلیٰ مذاق رکھتے ہیں۔ اپنی ایک نظم میں غالب کو اپنی عقیدت کا خراج پیش کرتے ہوئے یہاں تک کہہ دیا ہے۔ ع

"لطفِ گویائی میں تیری ہمسری ممکن نہیں"

۱۲۔ مرزا غالب کی غزلیں

(الف) حسن اور عشق کی کارفرمائی

کسی ذات یا شے سے دلی لگاؤ کا نام محبّت ہے۔ یہ لگاؤ جب حد سے بڑھ جاتا ہے تو عشق کہلاتا ہے۔ عشق ایک پاکیزہ جذبہ ہے۔ اس کا تعلق حُسن سے ہے۔ حسین چیز سبھی کو پسند آتی ہے۔ حُسن کیا ہے؟ جو چیز بھی آنکھوں میں نور اور دل میں سرور پیدا کرے حُسن ہے۔ حُسن ظاہری بھی ہوتا ہے اور باطنی بھی۔ باطنی حسن کبھی کبھی ظاہری حسن سے بھی بڑھ جاتا ہے۔ سیرت صورت سے بھی زیادہ متاثّر کرتی ہے۔

محبّت کا جذبہ شعلہ کی طرح دل میں بھڑکتا اور عاشق کو بے چین رکھتا ہے۔ شیفتہ

شاید اسی کا نام محبّت ہے شیفتہ ۔۔۔ اک آگ سی ہے سینے کے اندر لگی ہوئی

یہ آگ اچانک لگ جاتی ہے۔ خبر بھی نہیں ہوتی کب لگی۔؟ کیونکر لگی؟ اس آگ کا لگا لینا اپنے بس میں ہوتا ہے نہ اس کا بُجھا دینا۔

عشق پر زور نہیں، ہے یہ وہ آتش غالبؔ
کہ لگائے نہ لگے اور بُجھائے نہ بنے

مرزا صاحب کی غزلوں میں عشق کے جلوے جا بجا جگنوؤں کی طرح چمکتے نظر آتے ہیں۔ اُن کے خیال میں دُنیا کی رونق اور چہل پہل اسی جذبہ پر منحصر ہے ؎

رونقِ ہستی ہے عشقِ خانہ ویراں ساز سے
انجمن بے شمع ہے گر برق خرمن میں نہیں

دنیا کی رونق عشق کی وجہ سے ہے۔ یہ عشق خدا سے ہو یا خدا کے بندوں سے۔ اگر خرمن میں برق یعنی دلوں میں محبت نہیں تو یہ ایسی انجمن کی مانند ہے جس میں شمع کا اُجالا نہ ہو۔

عشق و محبّت میں مبتلا ہو کر آدمی عجب روحانی لذت محسوس کرتا ہے۔ ؎

محبّت میں نہیں کچھ فرق جینے اور مرنے میں
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں جس کافر پہ دم نکلے

عشق کی راہ میں جو دکھ آتے ہیں وہ انھیں ہنسی خوشی جھیلتا ہے۔ سچّے عاشق کو محبوب کے فراق میں روتے روتے جان تک دے دینے میں مزا ملتا ہے ؎

ہے مجھے ابرِ بہاری کا برس کر کھلنا
رونے روتے غمِ فرقت میں فنا ہو جانا

عشق کا دکھ دور کرنے کے لئے عاشق دوا کا احسان کبھی
گوارا نہیں کرتا ہے

دردِ منّت کشِ دوا نہ ہوا میں نہ اچّھا ہوا بُرا نہ ہوا

عاشق کو محبوب کے ظلم و ستم میں بھی مزا ملتا ہے۔ کسی وجہ سے
محبوب یہ ظلم و ستم ترک کر دے تو یہ بات عاشق پر شاق گزرتی ہے

اب جفا سے بھی ہیں محروم ہم اللہ اللہ
اس قدر دشمنِ اربابِ وفا ہو جانا

محبوب عاشق کو ستائے تو اس میں اُسے ایسا لطف آتا ہے
کہ اس کے جاری رہنے کا خواہشمند ہوتا ہے

کھیل سمجھا ہے کہیں چھوڑ نہ دے بھول نہ جائے
کاش یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

وہ ہر حال میں محبوب سے ربط رکھنا چاہتا ہے۔ چاہے اس
ربط کی بنیاد دشمنی ہی پر کیوں نہ ہو

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے　　　کچھ نہیں ہے تو عداوت ہی سہی

وہ دشمنی کو بھی کسی نہ کسی حد تک ذاتی لگاؤ کا نتیجہ سمجھتا ہے۔

یہ بات کس خوبی سے اِس شعر میں ظاہر کی ہے ؎

لاگ ہو تو اُس کو ہم سمجھیں لگاؤ　　　جب نہ ہو کچھ بھی تو دھوکا کھائیں کیا

عاشق کو اپنے محبوب سے ملنے اور اُس سے بات چیت کرنے میں بڑا مزا ملتا ہے۔ ملاقات ہو اور بات چیت کا موقع نہ ملے تو اُس کے دل کو تسکین نہیں ہوتی۔ اِس خیال کو کس اچھوتے انداز میں پیش کیا ہے ؎

بجلی اک کوند گئی آنکھوں کے آگے تو کیا

بات کرتے کہ میں لب تشنۂ تقریر بھی تھا

یہ خواہش اُس کے دل کے تقاضے سے ہوتی ہے اِس کو رد کرنا اُس کے اختیار میں نہیں ہوتا ؎

میں نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں

مانا کہ تیرے رُخ سے نگہ کامیاب ہے

ملنے کے بعد جدا ہونے پر جو کیفیت ہوتی ہے اُس کا بیان کس قدر

دردخیز ہے ؎

فرداؤدی کا تفرقہ اک بار مٹ گیا
تم کیا گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

محبوب وعدہ خلاف ہے۔ یہ بے اعتباری بھی زندگی بخشتی ہے ؎

ترے وعدے پر جئے ہم تو یہ جان جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے اگر اعتبار ہوتا

باوجود اس کے اُس کے ملنے کے وعدہ پر آنکھیں دروازے کی طرف لگی رہتی ہیں۔ آخر آدمی ہی تو ہے۔ گھبرا کر پکار اُٹھتا ہے ؎

وعدہ آنے کا وفا کیجے یہ کیا انداز ہے
تم نے کیوں سونپی ہے میرے گھر کی دربانی مجھے

محبوب کی جدائی میں عاشق پہ کیا گزرتی ہے ؎

کہوں کیا دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں غالبؔ
کہ بے تابی میں ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

اسی جدائی کی اذیت میں عاشق گھلتا ہے تو قسمت کھلتی ہے۔
محبوب آتا ہے۔ حال پوچھتا ہے۔ یہ کچھ بھی کہنے سے معذور ہے۔ کیسا

دردناک منظر ہے ؎

کہتے ہیں جب رہی نہ مجھے طاقتِ سخن
جانوں کسی کے دل کی میں کیوں کر کہے بغیر

محبوب کی آمد کی خبر پا کر عاشق کا دل بے اختیار اُس کے دیدار کی تمنّا کرتا ہے۔ حالت اتنی بگڑ چکی ہے کہ دل کی یہ بات دل ہی میں رہ جاتی ہے اور کھولنے کی کوشش میں آنکھیں ہمیشہ کے لئے بند ہو جاتی ہیں۔ کیسا حسرت ناک منظر ہے ؎

مند گئیں کھولتے ہی کھولتے آنکھیں ہے ہے
خوب وقت آئے تم اِس عاشقِ بیمار کے پاس

محبوب کی رسوائی کے ڈر سے عاشق جان دینے تک سے پرہیز کرتا ہے ؎

رازِ معشوق نہ رُسوا ہو جائے
ورنہ مر جانے میں کچھ بھید نہیں

محبوب کی اداؤں کا مشاہدہ حضرت غالب سے بڑھ کر کس نے کیا ہوگا ؎

لاکھوں لگاؤ ایک چرانا نگاہ کا
لاکھوں بناؤ ایک بگڑنا عتاب میں

محبوب اِس شان کا ہے تو اُس کا کوچہ کیسا ہو گا ؟

کم نہیں جلوہ گری میں ترے کوچے سے بہشت
یہی نقشہ ہے ولے اس قدر آباد نہیں

عاشق کو بہشت اِس لئے پیاری ہے کہ محبوب کے دیدار کی تمنّا اُس سے وابستہ ہے ؎

سنتے ہیں جو بہشت کی تعریف سب درست
لیکن خدا کرے وہ تری جلوہ گاہ ہو

اب تک اِس دریا کے چند قطرے یعنی حسن اور عشق سے تعلق رکھنے والے چند شعر پیش کئے گئے ہیں۔ یہ شعر غزل کے اصل مفہوم یعنی تغزّل کا رنگ ظاہر کرتے ہیں۔ اِس قسم کے اور بہت سے شعر مرزا صاحب کے دیوان میں ملیں گے۔ اب ایسے شعر پیش کئے جائیں گے جن میں دوسرے جذبوں کی نمائندگی ہوتی ہے۔

(ب) مرزا صاحب کی غزلوں میں اخلاقی تعلیم

مرزا صاحب کے بعض شعروں میں اخلاقی تعلیم بھی ملتی ہے۔ بچوّں کے لئے ان شعروں کا مطالعہ ضروری ہے۔ اِس قسم کے شعروں میں بعض تو بہت آسان ہیں مثلاً ؎

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی | نہ کہو گر بُرا کرے کوئی
روک لو گر غلط چلے کوئی | بخشد و گر خطا کرے کوئی

یا ؎

جو مدّعی بنے اُس کے نہ مدّعی بنئے
جو نا سزا کہے اُس کو نہ نا سزا کہئے

بعض ذرا مشکل ہیں۔ مگر غور کیا جائے تو سمجھ میں آجاتے ہیں۔ آدمی بات بات میں بگڑتا ہے۔ ہر شخص کو اُس کے لہجہ اور غصّہ کی شکایت ہوتی ہے۔ مرزا صاحب کی رائے میں بات کا انداز ایسا نہ ہو کہ جو سُنے وہ شکایت کرنے پر مجبور ہو ؎

گرمی سہی کلام میں لیکن نہ اِس قدر
کی جس سے بات اُس نے شکایت ضرور کی

نرمی کا مطلب یہ نہیں کہ آدمی اپنے دل کی سچّی بات کہنے سے گریز کرے۔ پھر تو کسی کو حق بات کہنے کا موقع ہی نہیں رہے گا۔ خدا کے بندے تو ایسے بھی ہوئے ہیں جنھوں نے پھانسی کے تختے پر حق بات کہی ہے۔ وقت کی مصلحت یا کسی بھی نوع کے خوف نے اُنھیں اپنے دل کی بات کہنے سے باز نہیں رکھّا۔ مرزا صاحب اسی حق گوئی اور آزادخیالی کی تعلیم دیتے ہیں ؎

جی ہی میں کچھ نہیں ہے ہمارے، وگرنہ ہم
سر جائے یا رہے نہ رہیں پر کہے بغیر

خودی غرور کے معنوں میں اچھی چیز نہیں۔ البتّہ خودداری ایسی خوبی ہے جس کا خیال ہر شخص کو رکھنا چاہیے۔ مرزا صاحب نے اِس جذبہ کا اظہار کس عمدگی سے کیا ہے ؎

بندگی میں بھی وہ آزادہ و خودبیں ہیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے درِ کعبہ اگر وا نہ ہوا

ایک اور شعر میں اسی جذبہ کی نمائندگی فرمائی ہے ؎

ہم پکاریں اور کھلے، یوں کون جائے
یار کا دروازہ پائیں گر کھلا

آدمی میں دشواریوں پر غلبہ پانے کا جتنا حوصلہ ہوگا۔ اُسی قدر دُنیا اُس کی قائل ہوگی ؎

توفیق باندازۂ ہمت ہے ازل سے
آنکھوں میں ہے وہ قطرہ جو گوہر نہ ہوا تھا

پانی کا قطرہ سمندر میں موتی بنتا ہے۔ یہ موتی شاہوں کے تاج اور شہزادیوں کے ہار میں جگہ پاتا ہے۔ یہ بات اپنی جگہ بہت بڑی ہے۔ مگر آنکھوں میں جگہ پانے کی بات ہی کچھ اور ہے۔ اِس کی قدر و قیمت کو نہ تاج پہنچتا ہے نہ کوئی زیور۔ اِس شعر سے یہ بات نکلتی ہے کہ تم میں ہمت ہوئی۔ اور تم مشکلوں پر غالب آنے کے بعد بڑے بڑے کام کر سکے۔ تو دنیا کی آنکھوں میں جگہ پاؤ گے۔ اس کی نظر میں تمہارا وقار بڑھے گا۔ تم اپنی ہمت اور حوصلے کے مطابق بڑے سے بڑا درجہ حاصل کر سکو گے۔

دنیا میں ایک سے ایک بڑھ کر ہے۔ کوئی علم میں، کوئی دولت میں، کوئی جسمانی طاقت میں، کوئی ذہنی یا اخلاقی بلندی میں۔ جن لوگوں میں ایسی کوئی خوبی نہیں ہوتی اور وہ اپنے آپ کو کمتر پاتے ہیں تو ایسے لوگوں سے حسد کرنے لگتے ہیں۔ اور اُن کا زوال چاہتے ہیں۔ مرزا غالب کی تلقین یہ ہے۔

حسد سے دل اگر افسردہ ہے گرمِ تماشا ہو
کہ چشمِ تنگ شاید کثرتِ نظارہ سے وا ہو

یعنی کسی عزیز، ساتھی یا ہم پیشہ کی شہرت اور عزت دیکھ کر کسی کے دل میں جلن اور کڑھن پیدا ہونے لگے تو اُسے آنکھیں کھول کر دنیا پر نظر ڈالنی چاہیئے، امید ہے کہ اِس تجربہ سے وہ حسد کرنا چھوڑ دے گا اور اپنی محنت اور کوشش سے آگے بڑھ کر دکھائے گا۔ مرزا صاحب کے اس علاج سے امید ہے کہ حسد کا مرض دور ہو جائے۔ ورنہ بقول مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھیؒ

حاسد کو ایک دم نہیں راحت جہان میں
رنج و حسد ہے جان ہے جب تک کہ جان میں

اُسے عمر بھر حسد کی آگ میں جلنا پڑے گا۔

(ج) مرزا غالب کے بہت سے اشعار

ضرب المثل کے طور پر کام آتے ہیں

مرزا غالب کی غزلوں کے شعر تقریر اور تحریر میں بے شمار موقعوں پر کام آتے ہیں۔ گویا یہ شعر ضرب المثل کا کام دیتے ہیں۔ یہاں چند مثالیں پیش کی جاتی ہیں ؎

غالبؔ بُرا نہ مان جو واعظ بُرا کہے
ایسا بھی ہے کوئی کہ سب اچّھا کہیں جسے

آپس کے تعلقات پر نظر ڈالئے۔ یہ بات ظاہر ہو گی کہ کسی شخص میں خواہ کتنی ہی خوبیاں ہوں۔ سب لوگ اُسے اچّھا نہیں سمجھتے۔ کچھ نہ کچھ خرابی اور خامی نکال ہی لیتے ہیں۔ یہ شعر ایسے ہی موقعوں پر استعمال ہوتا ہے۔

؎ دوست غمخواری میں میری سعی فرمائیں گے کیا
زخم کے بھرنے تلک ناخن نہ بڑھ آئیں گے کیا

آدمی پر پے در پے ایسی مصیبتیں آتی ہیں کہ وہ آرام اور اطمینان کی زندگی سے مایوس ہو جاتا ہے۔ دوستوں کی اعانت اور ہمدردی بھی اس کی ڈھارس نہیں بندھاتی۔ اُسے اندیشہ رہتا ہے کہ میرے دوست میرا ایک دکھ دور کریں گے تو دوسرا دکھ مجھے اپنے چنگل میں پھنسا لے گا۔

؎ لو وہ بھی کہتے ہیں کہ یہ بے ننگ و نام ہے
یہ جانتا اگر تو لٹاتا نہ گھر کو میں

آدمی محبّت یا عقیدت کی بنا پر ہر قسم کا نقصان اُٹھاتا ہے گھر بار، مال و دولت، عزیز آشنا سب سے کنارہ کشی اختیار کر لیتا ہے۔ یہی نقصان اُس کے لئے جنجال بن جاتا ہے۔ جن کی خاطر یہ سب کچھ کیا گیا۔ وہی جب اِن خامیوں کا احساس دلاتے ہیں تو بے ساختہ یہ شعر زبان پر آجاتا ہے۔

؎ قیدِ حیات و بندِ غم اصل میں دونو ایک ہیں
موت سے پہلے آدمی غم سے نجات پائے کیوں

انسان جب تک زندہ ہے۔ کسی نہ کسی دکھ میں گھرا رہتا ہے۔ کبھی بیمار ہوگا کبھی بیکار۔ کبھی کسی پیارے کی جدائی اُس پر بار ہوگی تو کبھی کسی دشمن کے پنجے میں گرفتار۔ اِسی خیال کو ایک اور شعر میں نئے انداز سے ادا فرمایا ہے ؎

غمِ ہستی کا اسدؔ کس سے ہو جز مرگ عِلاج
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہونے تک

؎ نہ لُٹتا دن کو تو کیوں رات کو یوں بے خبر سوتا
رہا کھٹکا نہ چوری کا دعا دیتا ہوں رہزن کو

وقتی نقصان آدمی کو پریشان کر دیتا ہے۔ اُسے سکون کی تلاش ہوتی ہے۔ اِس نقصان کی یاد رہ رہ کر اُس کے دل پر آرا چلاتی ہے۔ اِس بےچینی کو چین سے بدلنے کے لئے حضرت غالب نے کیا اچھّی تدبیر سجھائی ہے

اِسی قسم کے اور بھی چند شعر یاد رکھیے اور مزید شعر دیوانِ غالب

میں تلاش کیجیے۔

۵ رات دن گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہے گا کچھ نہ کچھ گھبرائیں کیا

۵ آہ کو چاہیے اک عمر اثر ہونے تک
کون جیتا ہے تری زلف کے سر ہونے تک

۵ ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن
خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک

۵ وفا کیسی کہاں کا عشق جب سر پھوڑنا ٹھیرا
تو پھر اے سنگ دل تیرا ہی سنگِ آستاں کیوں ہو

۵ مہرباں ہو کے بلا لو مجھے چاہو جس وقت
میں گیا وقت نہیں ہوں کہ پھر آبھی نہ سکوں

۵ بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالبؔ
تماشائے اہلِ کرم دیکھتے ہیں

۵ غالبِؔ خستہ کے بغیر کون سے کام بند ہیں
روئیے زار زار کیا کیجیے ہائے ہائے کیوں

(۷) مرزا غالب کی غزلوں میں معنی آفرینی

مرزا غالب اپنے کسی خط میں ایک دوست کو لکھتے ہیں "بھائی! شاعری معنی آفرینی ہے۔ قافیہ پیمائی نہیں۔"

معنی آفرینی کا مطلب ہے نئی بات پیدا کرنا۔ یا بات میں سے بات نکالنا۔ آپ نے بعض شعروں میں ایسی ایسی نئی باتیں بیان کی ہیں کہ اُنھیں پڑھ کر حیرت اور خوشی کا عجیب مِلا جُلا احساس ہوتا ہے۔ عام خیال اور نئے خیال میں کیا فرق ہے۔ اِس بات کو سمجھنے کے لئے مرزا صاحب کے چند شعر دیکھیے ؎

اور بازار سے لے آئے اگر ٹوٹ گیا

جامِ جم سے یہ مرا جامِ سفال اچھا ہے

جامِ جم ایران کے ایک مشہور بادشاہ جمشید کے پیالے کا نام ہے۔ اس پیالے میں کوئی ایسی بات رکھی گئی تھی جس سے دنیا کے حالات کا اندازہ ہو جاتا تھا۔ یہ جام کتنا قیمتی ہو گا۔ اِس کے مقابلے میں مٹی کا

پیالہ کچھ بھی نہیں۔ مگر حضرتِ غالب نے اِس مٹی کے پیالے کا رُتبہ جمشید کے جام سے بڑھا دیا۔ جمشید کے پیالے سے مٹی کا پیالہ اس لئے بہتر ہے کہ وہ اگر ٹوٹ جائے تو اُس کا بدل ممکن نہیں۔ یہ ٹوٹ جائے تو بازار سے دوسرا مِل سکتا ہے۔

محبوب عاشق کی نگاہ میں سب سے حسین ہوتا ہے۔ حسن کی یہ پذیرائی محبوب کو مغرور بنا دیتی ہے۔ کسی اور حسین کا دیکھنا یا اُس کا ذکر سُننا اُسے گراں گزرتا ہے۔ کسی دوسرے کا حسن ناگوار ہونا اور بات ہے اور اپنا ہی عکس آئینہ میں دیکھ کر الجھنا یہ نئی بات ہے۔ ؎

الجھتے ہو تم اگر دیکھتے ہو آئینہ
جو تم سے شہر میں ہوں ایک دو تو کیوں کر ہو

مرزا صاحب نے اس شعر میں یہ بات نئی پیدا کی ہے کہ اُن کا محبوب اس قدر نازک مزاج ہے کہ کسی دوسرے محبوب کا تو الگ رہا۔ اُسے اپنے عکس کا وجود بھی گوارا نہیں۔

حضرت سعدی شیرازی کی غزل کا ایک شعر ہے ؎

گفتہ بودم چو بیائی غمِ دل با تو بگویم
چہ بگویم کہ غم از دل برود چوں تو بیائی

میں نے سوچا تھا کہ اے میرے محبوب! جب تو آئے گا تو اپنے درد و غم کا حال تجھے سناؤں گا۔ مگر تیرے آجانے سے اتنی خوشی ہوتی ہے کہ دل میں درد و غم کا احساس تک نہیں رہتا۔

مرزا صاحب نے معنی آفرینی سے کام لے کر اِس خیال کو اِس طرح ترقی دی ہے ؎

اُن کے دیکھے سے جو آجاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھّا ہے

اِس میں نئی بات یہ ہے کہ محبوب کے آجانے سے یہی نہیں کہ دل میں درد اور غم کا احساس نہیں رہتا بلکہ چہرے کی حالت بھی بدل جاتی ہے افسردگی کی زردی کی جگہ شادمانی کی سُرخی چھا جاتی ہے۔ یہ خیال تک نہیں ہو سکتا کہ عاشق درد و غم میں کبھی مبتلا رہ چکا ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ آدمی جو کچھ چاہتا ہے کر سکتا ہے۔ بعض کا خیال ہے کہ ع وہی ہوتا ہے جو منظورِ خدا ہوتا ہے۔ یعنی آدمی مجبور رہے۔ مرزا صاحب نے اپنی نکتہ آفرینی سے ایک واضح مثال پیش کر دی ہے ؎

رو میں ہے رخشِ عمر کہاں دیکھیے تھمے
نے ہاتھ باگ پر ہے نہ پا ہے رکاب میں

سوار کی بے اختیاری اور گھوڑے کا قابو سے باہر ہونا اس سے بہتر بیان نہیں ہو سکتا۔ ہم آئے دن دیکھتے ہیں کہ انسانی زندگی بس اچانک ختم ہو جاتی ہے۔ نہ بچپن اور لڑکپن کا سوال اٹھتا ہے نہ جوانی اور بڑھاپے کا۔ بےبسی اور بے اختیاری ظاہر ہے۔ آپ اِن شعروں پر بھی غور کیجیے۔ ہر شعر میں معنی آفرینی کی وضاحت ہوگی۔

؎ تم شہر میں ہو تو ہمیں کیا غم جب اٹھیں گے
لے آئیں گے بازار سے جا کر دل و جاں اور

؎ میں نے مجنوں پہ لڑکپن میں اسدؔ
سنگ اٹھایا تھا کہ سر یاد آیا

ہے نہ مارا جان کر بے جرم، قاتل تیری گردن پر
رہا مانندِ خونِ بے گنہ حق آشنائی کا

ہے اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا
غیر نے کی آہ لیکن وہ خفا مجھ پر ہوا

ہے زنّار باندھ سبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو چلے ہے راہ کو ہموار دیکھ کر

ہے بس کہ دشوار ہے ہر چیز کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں انساں ہونا

اِسی قسم کے اور بھی عنوان مرزا صاحب کی شاعری کی رنگا رنگی ظاہر کرنے کے لئے قائم کئے جا سکتے ہیں۔ لیکن اِس کتابچہ کے لئے اتنا ہی کافی ہے۔ بچّوں کو کلامِ غالب کے ذاتی مطالعہ سے خود حظ اٹھانا چاہئے۔ اب ایک ایسی غزل پیش ہے جس میں بہار کی بڑی پیاری تصویر ہے۔ اور ایک عام فہم پوری غزل۔ اِس سے اُن کی غزل کی مجموعی خوبی کا اندازہ بخوبی ہو جائے گا۔

---

(۸) بہاریہ غزل

پھر اس انداز سے بہار آئی — کہ ہوئے مہر و مہ تماشائی

دیکھو اے ساکنانِ خطۂ خاک — اس کو کہتے ہیں عالم آرائی

کہ زمیں ہو گئی ہے سر تا سر — روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزے کو جب کہیں جگہ نہ ملی — بن گیا روئے آب پر کائی

سبزہ و گُل کو دیکھنے کے لئے — چشمِ نرگس کو دی ہے بینائی

ہے ہوا میں شراب کی تاثیر — بادہ نوشی ہے بادپیمائی

کیوں نہ دنیا کو ہو خوشی غالبؔ
شاہِ دیندار نے شفا پائی

اِس شعر میں بہادر شاہ بادشاہ کے بیماری سے شفا پانے کی طرف اشارہ ہے۔

(۹) غزل

ابنِ مریم ہوا کرے کوئی — میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی　　ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی

بات پر واں زبان کٹتی ہے　　وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ　　کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

نہ سنو گر بُرا کہے کوئی　　نہ کہو، گر بُرا کرے کوئی

روک لو گر غلط چلے کوئی　　بخش دو گر خطا کرے کوئی

کون ہے جو نہیں ہے حاجتمند　　کس کی حاجت روا کرے کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے　　اب کسے رہنما کرے کوئی

جب توقع ہی اُٹھ گئی غالبؔ
کیوں کسی کا گلہ کرے کوئی

تیسرا باب

۱۳ــ کلامِ غالب کی باقی قسمیں

(الف) قصیدہ قصیدہ ایسی نظم کا نام ہے جس میں کسی کی خوبی یا بُرائی بیان کی جائے۔ خوبی کو مدح اور بُرائی کو قدح یا ہجو کہتے ہیں۔ مرزا صاحب نے مدحیہ قصیدے تو کئی لکھے ہیں۔ مگر ہجو سے اپنے قلم کو آلودہ نہیں ہونے دیا۔ ان میں بھی بعض قصیدے منقبت یعنی حضرت علیؓ کی شان میں ہیں۔ باقی قصیدوں میں دو قصیدے نہایت نمایاں ہیں۔ ایک جس کا مطلع یہ ہے ؎

ہاں مہِ نو سنیں ہم اُس کا نام
جس کو تو جھک کے کر رہا ہے سلام

دوسرا ؎

صبحِ دم دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھُلا

یہ دونوں قصیدے بادشاہ بہادر شاہ کی مدح میں ہیں۔ مرزا صاحب کے قصیدوں میں خاص بات یہ ہے کہ قصیدہ کی

تشبیب یعنی تمہید طویل ہوتی ہے اور مدح اگرچہ اعلیٰ پایہ کی ہوتی ہے۔ مگر صرف چند شعروں میں اُس کا حق ادا کر دیا جاتا ہے۔

یہ قصیدے کافی مشکل ہیں۔ آپ بڑے ہو کر پڑھیں گے تو اُن کی خوبیوں سے بخوبی واقف ہو سکیں گے۔

(ب) **مثنوی** مثنوی نظم کی وہ قسم ہے جس کے ہر شعر کے دونوں مصرعے ہم قافیہ ہوں۔ کوئی بات، واقعہ، قصّہ، جذبہ، منظر غرض سب کچھ مثنوی میں بیان ہو سکتا ہے۔ مرزا صاحب کو آم بہت مرغوب تھے۔ اس لئے نمونے کے طور پر یہاں اُس مثنوی کے چند شعر پیش کئے جاتے ہیں جو "آموں کی تعریف" میں آپ نے لکھی ہے:-

بارے آموں کا کچھ بیاں ہو جائے ... خامہ نخلِ رطب فشاں ہو جائے

آم کا کون مردِ میداں ہے ... ثمر و شاخ گوئے و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں ... آئے یہ گوئے اور یہ میداں

آم کے آگے پیش جائے خاک ... پھوڑتا ہے جلے پھپھولے تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور ... بادۂ ناب بن گیا انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے ... شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو، تمھیں خبر کیا ہے
آم کے آگے نیشکر کیا ہے
نہ گل اس میں نہ شاخ و برگ نہ بار
جب خزاں ہو تب آئے اس کی بہار
نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر
آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرے کے تار کا ہے ریشہ نام
یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنّت سے
انگبیں کے بحکمِ ربّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں سربمہر گلاس
تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں ورنہ اور کہاں یہ نخل

(ج) مرثیہ گوئی | کسی کی وفات پر غم کے اظہار کا نام مرثیہ ہے۔ مرثیہ کسی قوم ملک یا تہذیب کی تباہی پر بھی کہا جا سکتا ہے۔ مرثیہ اُن نظموں کو بھی کہتے ہیں جو امام حسینؑ اور اُن کی شہادت کے بارے میں لکھی جاتی ہیں۔ ان میں اُن حادثوں کا دردناک بیان ہوتا ہے جو کربلا کے میدان میں پیش آئے۔ غالبؔ نے بھی اِس قسم کا ایک مرثیہ لکھنے کی کوشش کی۔ مگر طبیعت اس طرف مائل نہ ہو سکی۔ بس تبرک کے طور پر تین بند لکھ کر یہ سلسلہ ختم کر دیا۔ البتہ غزل کی

صورت میں اُن کے دو ایک مرثیہ ہیں۔ ان میں نواب زین العابدین عارف کا مرثیہ نہایت درد انگیز اور رقّت خیز ہے۔ عارف اُن کی بیوی کے بھانجے اور شاعری میں اُن کے ہونہار شاگرد تھے۔ جوانی میں اللہ میاں کو پیارے ہو گئے۔ اُنھیں کی وفات پر یہ مرثیہ لکھا ہے۔

مرثیۂ عارف

لازم تھا کہ دیکھو مرا رستہ کوئی دن اور
تنہا گئے کیوں، اب رہو تنہا کوئی دن اور
آئے ہو کل اور آج ہی کہتے ہو کہ جاؤں
مانا کہ ہمیشہ نہیں اچھا کوئی دن اور
جاتے ہوئے کہتے ہو قیامت کو ملیں گے
کیا خوب! قیامت کا ہے گویا کوئی دن اور
ہاں اے فلکِ پیر! جواں تھا ابھی عارف
کیا تیرا بگڑتا جو نہ مرتا کوئی دن اور
تم ماہِ شبِ چار دہم تھے مرے گھر کے

پھر کیوں نہ رہا گھر کا وہ نقشا کوئی دن اور

تم کون سے تھے ایسے کھرے داد و ستد کے
کرتا ملک الموت تقاضا کوئی دن اور

مجھ سے تمھیں نفرت سہی نیّر[1] سے لڑائی
بچّوں کا بھی دیکھا نہ تماشا کوئی دن اور

گزری نہ بہر حال یہ مدّت خوش و ناخوش
کرنا تھا جواں مرگ گزارا کوئی دن اور

ناداں ہو جو کہتے ہو کہ کیوں جیتے ہو غالب
قسمت میں ہے مرنے کی تمنّا کوئی دن اور

(د) رباعی — رباعی ایسی نظم کا نام ہے جس میں چار مصرعے یا دو شعر ہوں۔ رباعی کو دو بیتی بھی کہتے ہیں۔ رباعی کا پہلا، دوسرا اور چوتھا مصرعہ ہم قافیہ ہوتا ہے۔ چند رباعیاں آپ بھی سنیئے۔ پہلی رباعی ظرافت کا نمونہ ہے۔ دوسری میں بادشاہ کے تحفہ یعنی

---

[1] نوّاب ضیاء الدین خاں نیّر۔ عارف کے والد۔

سیم کے بیجوں کا شکریہ ہے۔ تیسری رباعی مرزا غالب کو مشکل پسندی اور مہمل نگاری کا طعنہ دینے والے ہم عصر شاعروں کے بارے میں ہے۔

(۱) سامانِ خور و خواب کہاں سے لاؤں
آرام کے اسباب کہاں سے لاؤں
روزہ مرا ایمان ہے غالبؔ لیکن
خس خانۂ و برفاب کہاں سے لاؤں

---

(۲) ان سیم کے بیجوں کو کوئی کیا جانے
بھیجے ہیں جو ارمغاں شہ والا نے
گن کر دیویں گے ہم دعائیں سو بار
فیروزے کی تسبیح کے ہیں سو دانے

---

(۳) مشکل ہے زبس کلام میرا اے دل
سُن سُن کے اُسے سخنورانِ کامل

آساں کہنے کی کرتے ہیں فرمائش
گویم مشکل وگرنہ گویم مشکل

سہرے، تاریخیں مرزا صاحب نے سہرے بھی لکھے ہیں اور تاریخیں بھی کہی ہیں۔ ان کا ذکر آچکا ہے۔

تاریخ گوئی ایک ہنر ہے۔ اِس کا سمجھنا شرح چاہتا ہے۔ آپ اسے عروض کی کسی کتاب سے سمجھ لیں۔ غالب کی کئی اچھی اچھی ایسی تاریخیں ہیں جنھیں پڑھ کر اُن کی جدّت کی داد دئے بغیر نہیں رہا جاتا۔

قطعہ دو یا دو سے زیادہ شعر کسی ایک مضمون پر ہوں تو وہ قطعہ کہلاتے ہیں۔ قطعہ کے ہر شعر کا دوسرا مصرع ہم قافیہ ہوتا ہے۔ مرزا صاحب نے اچھے اچھے قطعہ لکھے ہیں مثلاً "گزارش بخدمت شاہ" اور "قطعۂ معذرت" وغیرہ۔ اُن کا ایک قطعہ اپنے رنگ کا بےمثل ہے۔ ہے ذرا مشکل تاہم بار بار پڑھنے اور مناسب غور و فکر سے سمجھ میں آسکتا ہے۔ میں نے اس قطعہ کو کئی حصّوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ سمجھنے میں آسانی ہو۔

قطعہ (۷)

۱۔ اے تازہ واردانِ بساطِ ہوائے دل
زنہار! اگر تمہیں ہوسِ نائے و نوش ہے
دیکھو مجھے جو دیدۂ عبرت نگاہ ہو
میری سنو جو گوشِ حقیقت نیوش ہے

۲۔ ساقی بہ جلوہ دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب بہ نغمہ رہزن تمکین و ہوش ہے

۳۔ یا شب کو دیکھتے تھے کہ ہر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ہے
لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدائے چنگ
یہ جنتِ نگاہ وہ فردوسِ گوش ہے

۴۔ یا صبحِ دم جو دیکھئے آ کر تو بزم میں
نے وہ سرور و سوز نہ جوش و خروش ہے
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ہوئی
اِک شمع رہ گئی ہے سو وہ بھی خموش ہے

۵۔ آتے ہیں غیب سے یہ مضامیں خیال میں
غالبؔ صریرِ خامہ نوائے سروش ہے

قطعۂ مذکور کی تعبیر

آپ نے یہ قطعہ پڑھا۔ اِس کو بار بار پڑھئے اور سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ کسی سے پوچھئے۔ سوچئے پھر سوچئے۔ سمجھ میں آ ہی جائے گا۔ کسی شعر کا مطلب کئی طرح بیان کیا جا سکتا ہے۔ ہر شخص اپنے علم اور اپنے ذوق کے مطابق معنیٰ نکالتا ہے۔ میں نے بھی اپنے طور پر اس قطعہ کا مفہوم سمجھنے کی کوشش کی ہے۔ آپ اسے بھی پڑھ لیں۔

کیا عجب ہے کہ اِس کا مطلب سمجھنے میں یہ تعبیرات پتے کا کام دے۔

حضرت غالب فرماتے ہیں۔ اے عیش و عشرت کی زندگی میں قدم رکھنے والو! اگر تمھیں نغمہ و شراب یعنی عیش و طرب کی طلب اور ہوس ہے تو خبردار ہو جاؤ!! میں نے اپنی جوانی میں یہ کیفیت دیکھی ہے۔ کیا عجب ہے کہ میرا مشاہدہ اور تجربہ تمھاری آنکھیں کھول دے۔

اگر کسی کا حسرت ناک انجام دیکھ کر تم عبرت حاصل کر سکتے ہو۔ اور نہ تمھارے کان سچی مگر کڑوی بات سننے کی تاب لا سکتے ہوں۔ تو میری بات پر دھیان دو اور اِسے پوری توجّہ سے سنو۔

میں نے اپنی جوانی کی دیوانگی میں ایسی ہی ہوس کی تھی۔ عیش و نشاط کی محفلیں گرم ہوتیں۔ یار دوستوں کے جمگھٹے رہتے۔ حسین اور جمیل پیکروں پر نظر پڑتی تو عقل و دانش تو کیا دین و ایمان تک رخصت ہو جاتے۔

اگلے چند شعروں میں جو منظر پیش کیا گیا ہے اُس کی قلمی تصویر کاغذ پر کھینچ کر دکھاتا ہوں۔

ایک عالی شان ایوان ہے۔ فرش فروش سے آراستہ، جھاڑ فانوس سے پیراستہ، رات کا سہانا سماں ہے۔ کافوری شمعیں روشن ہیں۔ پورا ایوان نور کا بقعہ بنا ہوا ہے۔ سفید اور صاف چاندنی بچھی ہے۔ جسے دیکھ کر چاند بھی شرمائے۔ مسندیں سجی ہیں۔ گاؤ تکیے لگے ہیں۔ ایسی شان ہے کہ جمشید کے جشن کی آرائش جس کے آگے مات کھائے۔ اگر اور لوبان کی خوش بو فضا کو مہکا رہی ہے۔ پھولوں کے گلدستے کچھ ایسے قرینے سے چُنے گئے ہیں کہ ہر طرف بہار آرہی ہے۔

محفلِ طرب کا آغاز ہوتا ہے۔ جب کوئی زہرہ جمال، مشتری خصال، چھم چھم کرتی ناز سے اٹھلاتی، انداز اور ادائیں دکھاتی۔ لجاتی شرماتی، گاتی ناچتی، بھاؤ بتاتی قدم بڑھاتی آتی ہے تو واہ وا، سبحان اللہ! کیا گلا ہے، کیا ادا ہے، کا شور مچ جاتا ہے۔ یہ محفل ہے یا نور و سرور کا چھلکتا ہوا ایاغ، یہ جلسہ ہے یا رنگ برنگے پھولوں کا شاداب مہکتا ہوا باغ۔

طبلے کی تھاپ، سارنگی کی رول ٹوں، مجیروں کی جھن جھن، گھنگھروؤں کی چھن چھن ایک طلسمی سماں پیش کر رہی ہے۔

محفل کا گوشہ گوشہ نکہت بار ہے۔ جدھر نگاہ اٹھتی ہے منظر پُر بہار ہے۔ بادۂ ناب کا غبار اُڑ رہا ہے۔ جام پہ جام چل رہا ہے۔ گُل اندام ساقی کی رفتار کا کیا کہنا۔ اِدھر اُدھر پھرتی جس طرف نظر اٹھاتی ہے ایک بجلی سی گرا کر چلی جاتی ہے مطربہ کی رسیلی آواز، اُس کے سُریلے بول، فردوسی نغموں کو مات کرتے ہیں۔ آواز کی شیرینی، انداز کی رنگینی، سُروں کا اُتار چڑھاؤ، سازوں کا زیر و بم، ایک عجیب کیفیت دلوں پر طاری کئے ہوئے ہے کہ ہر مست اور مدہوش محفل نشیں سے

ہم وہاں ہیں جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی،

کا مصداق بنا ہوا ہے۔

مگر آہ! یہ سب کچھ وقتی اور عارضی تھا۔ صبح ہوئی۔ آنکھ کھلی۔ سے

وہ بادۂ شبانہ کی سرمستیاں کہاں
اُٹھئے بس اب کہ لذّتِ خوابِ سحر گئی

دیکھا تو کچھ بھی نہیں۔ نہ خوشی کے قہقہے، نہ مسرّت کے چہچہے۔ نہ ہاؤ ہو کا شور، نہ جوشِ مسرّت کا زور، نہ عیش و عشرت کی بساط، نہ نشاط نہ انبساط، نہ رونق نہ چہل پہل کا نام۔ ایک ہو کا مقام ہے

تا سحر وہ بھی نہ چھوڑی تو نے اے بادِ صبا
یادگارِ رونقِ محفل تھی پروانے کی خاک

ہاں! ایک جلی بجھی شمع البتّہ نظر آئی مگر خاموش، عبرت اور حسرت کی تصویر، یہ ہے انجام اُس آغاز کا۔ اور یہ ہے انقلاب لیل و نہار کا۔

کیا اِس انقلاب سے یہ بات نہیں نکلتی کہ ہماری زندگی بے راہ روی میں نہ گزرے۔ ہم اُن قدروں کی پذیرائی کریں جو ان محفلوں کی طرح عارضی نہ ہوں۔ ایسی قدریں جو دوامی ہوں اور جس کی وجہ سے ہمارا نیک نام ہمیشہ ہمیشہ باقی رہے۔

آخری شعر میں حضرت غالبؔ فرماتے ہیں کہ میرے قلم سے اس وقت جو کچھ نکل رہا ہے غیبی آواز ہے۔ الہام ہے۔ روحانی ہدایت ہے، خدائی پیغام ہے۔ ہمیں یہ پیغام گوشِ ہوش سے سننا چاہیئے۔

چوتھا باب

مرزا غالب کی نثر نگاری

ادائے مطلب اور دوسری خاص خاص خوبیاں

مرزا غالب کی شاعری کے چند نمونے آپ کے سامنے ہیں۔ ان سے آپ کو اُن کے شعروں اور غزلوں کا کچھ نہ کچھ اندازہ ہوا ہوگا۔ اُن کا کلام عام اُردو شاعروں سے الگ اور ممتاز نظر آتا ہے۔ یہی حال اُن کی نثر کا ہے ان کی نثر سیدھی سادھی ہے۔ آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے۔ مگر ہے ایسی دل کو لبھانے والی کہ کسی مزیدار کہانی کی طرح اُسے بار بار پڑھنے کو جی چاہتا ہے۔ یہ وصف اُن کے نجی خطوں میں خاص طور پر نظر آتا ہے۔

یہ بات اِس لئے اور بھی قابلِ ذکر ہے کہ اُن کے زمانے میں خط یا تو فارسی میں لکھے جاتے تھے یا ایسی اُردو میں جس میں عربی

فارسی لفظوں کی کثرت اور تکلّف اور تصنّع کی بھرمار ہوتی تھی۔ خط لکھنے کا ایک بندھا ٹکا انداز تھا۔ مرزا غالب نے ایسے خطوں کی داغ بیل ڈالی کہ ہر شخص اُن کا مشتاق نظر آنے لگا۔ یہاں اُن کے ایسے ہی خطوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

خط اِس لئے لکھّا جاتا ہے کہ جو لوگ آنکھوں سے دور ہیں، اُن تک اپنے خیالات اور جذبات، اپنی خواہشات اور ضرورپات اور اپنے حالات اور واقعات پہنچائے جائیں۔ اِس مقصد کو خط کا مضمون پورا کرے۔ خط میں لفظ ایسے آئیں، حالات کی ترتیب اِس انداز کی ہو کہ جس کو خط لکھّا گیا ہے اُس کے مناسب حال ہو۔ جن لوگوں کو خط لکھّے جاتے ہیں۔ اُن میں کچھ لوگ رشتہ یا عمر کے لحاظ سے بڑوں میں شمار ہوتے ہیں، کچھ برابر والوں میں، اور کچھ چھوٹوں میں۔ بڑوں کے ساتھ خط وکتابت میں ادب کا لحاظ رکھّا جاتا ہے، برابر والوں کے ساتھ بے تکلّفی کا اور چھوٹوں کے ساتھ شفقت کا۔ تہذیب و شائستگی، شوخی اور ظرافت، تحریر کا فطری انداز اور دلچسپی ایسی باتیں ہیں جو کسی بھی خط کو دلچسپ بنا سکتی ہیں۔

مرزا صاحب نے اپنے خطوں کے بارے میں اپنی کتاب "پنج آہنگ" میں خود اس طرح لکھا ہے:-

"لکھنے کا میرا طریقہ یہ ہے کہ خط کا کاغذ اور قلم ہاتھ میں لے کر اور جسے خط لکھ رہا ہوں اُس کے مرتبے کا لحاظ رکھ کر مناسب لفظ سے اُسے خطاب کرتا ہوں۔ اور اپنا مدّعا لکھنا شروع کر دیتا ہوں۔ وہ جو القاب و آداب اور خیریت و خیر و عافیت کا دستور ہے اور جس سے خط خواہ مخواہ طویل ہو جاتا ہے۔ نظر انداز کرتا ہوں۔ خط و کتابت میں جو لوگ پختہ ہوتے ہیں۔ وہ ان فضول باتوں سے پرہیز کرتے ہیں۔"

اُنھوں نے مرزا حاتم علی مہرؔ اپنے ایک دوست کو لکھا ہے۔

"مرزا صاحب! میں نے وہ انداز تحریر ایجاد کیا ہے کہ ہزار کوس سے بہ زبان قلم باتیں کیا کرو اور ہجر میں وصال کے مزے لیا کرو۔"

اُردو زبان کے بہت سے عالموں اور ادیبوں کے خط چھپ چکے ہیں۔ اپنی اپنی جگہ وہ بھی دلچسپ ہیں۔ لیکن ابھی تک کسی بزرگ کے خط مرزا صاحب کے خطوں کے برابر نہیں خیال کئے جاتے۔

مرزا صاحب کے ان خطوں کی وجہ سے اُردو کی نثر یں سادہ لکھی جانے لگیں۔ ان خطوں کی اشاعت نے اُردو میں سلاست اور سادگی اور لطافت و ظرافت کی ایک نئی راہ دکھائی۔ ایسی راہ جس پر چل کر اُردو نثر کہیں سے کہیں پہنچ گئی۔

مرزا صاحب کی زندگی میں اُن کے خطوں کے دو مجموعے مرتّب ہو چکے تھے۔ ایک "عودِ ہندی" اور ایک "اُردوئے معلّٰی" خطوں کا مجموعہ "عودِ ہندی" چھپ بھی چکا تھا۔ آپ کی وفات کے بعد اور بھی خط ملے ہیں۔ اہلِ علم نے ان خطوں کو مختلف ترتیب اور مختلف ناموں سے شائع کیا ہے۔ ان میں مولانا امتیاز علی عرشی کے "مکاتیبِ غالب" مولانا غلام رسول مہرؔ کے "خطوطِ غالب" اور آفاق دہلوی کے "نادراتِ غالب" وغیرہ مطالعہ کے قابل ہیں۔

شروع میں جب مرزا صاحب کے سامنے ان خطوں کی طباعت اور اشاعت کی تجویز پیش ہوئی تو انھوں نے پسند نہیں کی۔ اُن کا کہنا تھا کہ نجی اور ذاتی باتوں کا پھیلانا کیا ضرور ہے۔ لیکن جب دوستوں کا اصرار بڑھا۔ اور مرزا صاحب کو اُن کی مقبولیّت کا یقین ہو گیا تو

انھوں نے یہ تجویز منظور کرلی۔

ان خطوں کی خوبی یہ ہے کہ ان سے مرزا صاحب کی زندگی کے بہت سے حالات معلوم ہو جاتے ہیں۔ اُن کے زمانے کے خاص خاص تاریخی واقعات پر روشنی پڑتی ہے۔ سنہ ستّاون کی پہلی جنگِ آزادی کے واقعات کی سنگینی کا اندازہ ہوتا ہے۔ واقعہ نگاری، منظر کشی، مسرّت یا غم کا اظہار، خلوص اور محبّت، شفقت اور رافت، دوستی اور بے تکلّفی، ہمدردی اور دلسوزی کے بہت سے نمونے ان خطوں میں ملتے ہیں۔

وہ کوئی واقعہ بیان کرتے ہیں تو اُس کی تصویر کھینچ دیتے ہیں۔ مثلاً ایک خط میں برسات کا ذکر اس طرح کیا ہے۔ "برسات کا حال نہ پوچھو۔ خدا کا قہر ہے۔ قاسم جان کی گلی سعادت خاں کی نہر ہے۔ میں جس مکان میں رہتا ہوں۔ عالم بیگ کے کٹڑے کی طرف کا دروازہ گر گیا۔ مسجد کی طرف کے دالان کا جو دروازہ تھا، گر گیا۔ سیڑھیاں گرا چاہتی ہیں۔ صبح کے بیٹھنے کا حجرہ جھک رہا ہے۔ چھت چھلنی ہو گئی۔ مینھ گھڑی بھر برسے تو چھت گھنٹہ بھر برسے"

مرزا حاتم علی مہر کے نام کے خط میں اپنے ڈاڑھی رکھنے کا حال اِس طرح لکھتے ہیں۔

"جب ڈاڑھی مونچھ میں بال سفید آگئے۔ تیسرے دن چیونٹی کے انڈے گالوں پر نظر آنے لگے۔ اِس سے بڑھ کر یہ ہوا کہ آگے کے دو دانت ٹوٹ گئے۔ ناچار مسّی بھی چھوڑ دی اور ڈاڑھی بھی۔ مگر یاد رہے کہ اِس بھونڈے شہر میں ایک وردی عام ہے۔ مُلّا، حافظ، بساطی، نیچہ بند، دھوبی، سقّا، بھٹیارا، جُلاہا، کُنجڑا، منہ پر ڈاڑھی سر پر بال۔ فقیر نے جس دن ڈاڑھی رکّھی اسی دن سر منڈایا۔"

منشی ہرگوپال تفتہ اپنے ایک شاگرد کو اپنے کرایہ کے گھر کی خرابی کا مرقّع اِس طرح پیش کرتے ہیں۔

"جس مکان میں رہتا تھا۔ مالک مکان نے وہ بیچ ڈالا۔ جس نے لیا۔ مجھ پر پیام بلکہ ابرام کیا کہ مکان خالی کر دو۔ مکان کہیں ملے تو اٹھوں۔ بیدرد نے مجھ کو عاجز کیا۔ مدد لگا دی۔

وہ صحن بالا خانے کا جس کا دو گز کا عرض اور دس گز کا طول ہے۔ اُس میں باڑھ بندھ گئی۔ رات کو وہیں سویا۔ گرمی کی شدّت

پاڑھ کا قرب، گمان یہ گزرتا تھا کہ یہ کٹکر ہے اور صبح کو مجھے پھانسی ملے گی۔"

مرزا صاحب کسی واقعہ کی چھوٹی چھوٹی باتوں کو اِس طرح لکھتے ہیں کہ پڑھنے میں بڑا مزا آتا ہے۔ شہاب الدین خاں ثاقبؔ کو ایک خط میں اپنے رامپور کے سفر کا حال لکھا ہے۔ دیکھیے اس سفر کی معمولی باتیں موتیوں کی طرح کاغذ پر ڈھلکتی دکھائی دے رہی ہیں۔

"دو تین گھڑی دن چڑھے احباب کو رخصت کر کے راہی ہوا۔ مقصد یہ تھا کہ پلکھوے رہوں۔ وہاں قافلے کی گنجائش نہ پائی۔ ہاپوڑ کو روانہ ہوا۔ دونوں برخوردار (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) گھوڑوں پر سوار پہلے چل دئے۔ چار گھڑی دن رہے ہاپوڑ کی سرائے میں پہنچا۔ دونوں بھائیوں کو بیٹھے ہوئے اور گھوڑوں کو ٹہلتے ہوئے پایا۔ گھڑی بھر دن رہے قافلہ آیا۔ میں نے چھٹانک بھر گھی داغ کیا۔ دو شامی کباب اس میں ڈال دئے۔ رات ہو گئی تھی۔ شراب پی۔ کباب کھائے۔ لڑکوں نے ارہر کی کھچڑی پکوائی۔ خوب گھی ڈال کر آپ بھی کھائی اور سب آدمیوں کو بھی کھلائی۔ دن کے واسطے سادہ سالن پکوا لیا۔ ترکاری

نہ ڈلوائی۔ چار پانچ بجے کے عمل سے ہاپوڑ سے چل دیا۔ سورج نکلے بابوگڑھ کی سرائے میں آپہنچا۔ چارپائی بچھائی۔ اُس پر بچھونا بچھاکر حُقّہ پی رہا ہوں۔ اور یہ خط لکھ رہا ہوں "

شوخی اور ظرافت میر مہدی مجروحؔ کو ایک خط کے جواب میں وبائے عام میں اپنے محفوظ رہنے کا حال کس شوخی سے بیان کیا ہے۔

" وبا کو کیا پوچھتے ہو۔ قدر انداز قضا کے ترکش میں یہ ہی تیر باقی تھا۔ قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا۔ وبا کیوں نہ ہو۔ لسان الغیب نے دس برس پہلے فرمایا ؎

ہو چکیں غالبؔ بلائیں سب تمام ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

میاں ۱۲۷۷ھ کی بات غلط نہ تھی۔ میں نے وبائے عام میں مرنا اپنے قابل نہ سمجھا واقعی اس میں میری کسرِ شان تھی۔ بعد رفع فسادِ ہوا سمجھ لیا جائے گا "

ایک دوست کو دسمبر ۱۸۵۸ء کی آخر تاریخوں میں خط لکھا ہے۔ انھوں نے اس کا جواب جنوری ۱۸۵۹ء کی پہلی یا دوسری کو لکھ بھیجا

ہے۔ اِس کے جواب میں اُن کو لکھتے ہیں: ۔

"دیکھو صاحب! یہ باتیں ہم کو پسند نہیں۔ ۱۸۵۸ء کا جواب ۱۸۵۹ء میں بھیجتے ہو۔ اور مزا یہ کہ جب تم سے کہا جائے گا۔ تو یہ کہو گے کہ میں نے دوسرے ہی دن جواب لکھا"۔

ایک دوست کو رمضان کے مبارک مہینے میں خط لکھا ہے۔ اُس میں لکھتے ہیں۔

"دھوپ بہت تیز ہے۔ روزہ رکھتا ہوں۔ مگر روزے کو بہلاتا رہتا ہوں۔ کبھی پانی پی لیا۔ کبھی حُقّہ پی لیا۔ کبھی کوئی ٹکڑا روٹی کا بھی کھا لیا۔ یہاں کے لوگ عجیب فہم رکھتے ہیں۔ میں تو روزہ بہلاتا ہوں، اور یہ صاحب فرماتے ہیں۔ تو روزہ نہیں رکھتا۔ یہ نہیں سمجھتے کہ روزہ رکھنا اور چیز ہے اور روزہ بہلانا اور بات ہے"۔

اظہارِ ہمدردی

ایک طرف یہ ہنسی اور چہل اور شوخی و ظرافت تھی۔ دوسری طرف غمناک واقعات کا بیان، ماتم پُرسی اور اظہارِ ہمدردی اِس طرح کرتے ہیں کہ پڑھنے والوں کو متاثّر کیے بغیر نہیں رہتے۔

یوسف مرزا ایک عزیز کو۔ اُن کے والد کی وفات پر جو خط انھوں نے لکھا ہے۔ اُس کا وہ حصہ پڑھیے جو اِس سانحہ سے تعلّق رکھتا ہے۔

"یوسف مرزا! کیوں کر لکھوں کہ تیرا باپ مر گیا۔ اور اگر لکھوں تو آگے کیا لکھوں۔ کہ اب کیا کرو۔ مگر صبر! یہ ایک شیوۂ فرسودہ، ابنائے روزگار کا ہے۔ تعزیّت یوں ہی کیا کرتے ہیں اور یہی کہا کرتے ہیں کہ صبر کرو۔ ہائے ایک کا کلیجہ کٹ گیا۔ اور لوگ اُسے کہتے ہیں کہ تو نہ تڑپ۔ بھلا کیوں نہ تڑپے گا۔ صلاح اِس امر میں نہیں بتائی جاتی۔ دعا کو دخل نہیں۔ دوا کا لگاؤ نہیں۔ پہلے بیٹا مرا۔ پھر باپ مرا۔ مجھ سے اگر کوئی پوچھے کہ بے سر و پا کس کو کہتے ہیں تو میں کہوں گا یوسف مرزا کو۔"

اب میں مرزا صاحب کے چند خط یہاں درج کرتا ہوں۔ اِس باغ کی سیر آپ خود کر لیجیے۔

مرزا صاحب کے چند خط

۱۔ رواداری | منشی ہرگوپال تفتہؔ، اپنے ایک عزیز شاگرد کے نام۔

میری جان! کیا سمجھتے ہو۔ سب مخلوق تفتہؔ اور غالبؔ کیونکر بن جائیں ع

ہر کسے را بہرِ کارے ساختند

بندہ پرور! میں بنی آدم کو مسلمان ہو یا ہندو یا نصرانی عزیز رکھتا ہوں۔ اور اپنا بھائی گنتا ہوں۔ دوسرا مانے یا نہ مانے۔ باقی رہی وہ عزیزداری جس کو اہلِ دنیا قرابت کہتے ہیں۔ اُس کو قوم اور ذات اور مذہب اور طریق شرط ہے۔ اور اس کے مراتب اور مدارج ہیں۔ (اس کے بعد اور باتیں ہیں)

۲۔ بیوی کی تسلّی اور تشفّی کے لئے | حکیم غلام نجف خاںؔ، ایک عزیز کے نام۔

اقبال نشان عضد الدولہ حکیم غلام نجف خاں کو غالب علی شاہ کی دعا پہنچے۔

تمہارے خط سے معلوم ہوا کہ تم کو میرے کھانے پینے سے تشویش ہے۔ خدا کی قسم! میں یہاں خوش اور تندرست ہوں۔ دن کا کھانا ایسے وقت آتا ہے کہ پہر دن چڑھے تک میرے آدمی بھی روٹی کھا چکتے ہیں۔ شام کا کھانا بھی سویرے آتا ہے۔ کئی طرح کے سالن، پلاؤ، تنجن، پسندے، دونوں وقت۔ روٹیاں خمیری۔ چپاتیاں، مربّے اچار۔ میں بھی خوش لڑکے بھی خوش۔ (باقر علی خاں اور حسین علی خاں) کلّو اچھا ہوگیا۔ سقا۔ مشعلچی، خاکروب سرکار سے متعیّن ہے۔ حجام دھوبی نوکر رکھ لیا ہے۔ آج تک دو ملاقاتیں ہوئی ہیں (نواب یوسف علی خاں ناظم والئ رامپور سے) تعظیم، تواضع، اخلاق کسی باب میں کمی نہیں۔

ظہیر الدین خاں بہادر کو دعا پہنچے۔ یہ خط لے کر تم دادی صاحبہ (بیگم غالب) کے پاس جاؤ۔ اور یہ خط سناؤ۔ اور اُن سے کہو کہ میں نے جو بات تم سے کہی تھی۔ وہ غلط تھی۔ باقی خیر و عافیت۔

۳۔ اظہار شفقت

مرزا باقر علی خاں طالب فرزند عارف کے نام۔

اقبال نشان مرزا باقر علی خاں کو غالبِ نیم جان کی دعا پہنچے۔ تمہارا خط آیا۔ تمہارے روزگار کی درستی آگے سُن چکا ہوں۔ اب تمہارے لکھنے سے دیکھ بھی لی۔ دل میرا خوش ہوا۔ اور تم خاطر جمع رکھّو۔ جیسا مہاراج (روالی الور) نے تم سے کہا ہے۔ تمہاری ترقّی انشاء اللہ جلد ہوگی مجھ سے جو تم گلہ کرتے ہو خط کے نہ بھیجنے کا۔ بھائی اب میری انگلیاں نکمّی ہوگئی ہیں۔ اور بصارت میں ضعف آگیا ہے۔ دو سطریں نہیں لکھ سکتا۔ اطراف و جوانب سے خطوط آئے ہوئے دھرے رہتے ہیں۔ جب کوئی دوست آجاتا ہے۔ میں اُس سے جواب لکھوا دیتا ہوں۔ پرسوں کا خط تمہارا آیا ہوا دھرا تھا۔ اب اِس وقت یوسف علی خاں آگئے ہیں۔ میں نے اُن سے یہ خط لکھوا دیا ہے۔ تمہاری دادی (بیگم غالب) اچھی طرح ہیں۔ تمہارے گھر میں سب خیر و عافیت ہے۔ تمہاری لڑکی اچھی طرح ہے۔ کبھی روز کبھی دوسرے تیسرے میرے پاس آجاتی ہے۔

۴ - قیامِ رامپور کا حال | میر مہدی حسین مجروح ایک چہیتے شاگرد کے نام۔

" آہا ہا ہا! میرا پیارا مہدی آیا۔ آؤ بھائی! مزاج تو اچھا ہے۔ بیٹھو۔ یہ رامپور ہے۔ دارالسرور ہے۔ جو لطف یہاں ہے وہ اور کہاں ہے۔؟ سبحان اللہ! شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے۔ اور کوسی اُس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آبِ حیات کی کوئی سوت اُس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی! آبِ حیات عمر بڑھاتا ہے۔ اتنا شیریں کہاں ہوگا۔

تمہارا خط پہنچا۔ تردّد عبث ہے۔ میرا مکان ڈاک گھر کے قریب اور ڈاک منشی میرا دوست ہے۔ نہ عُرف لکھنے کی حاجت نہ مُحلّے کی حاجت۔ بے وسواس خط بھیج دیا کیجئے۔ اور جواب لیا کیجئے۔ یہاں کا حال سب خوب ہے۔ اور صحبت مرغوب ہے۔ اِس وقت تک مہمان ہوں۔ دیکھوں کیا ہوتا ہے۔ تعظیم و توقیر میں کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں ہے۔

۵۔ واقعہ نگاری

اِس خط میں مرزا صاحب نے نواب کلب علی خاں کی مسند نشینی کے جشن کا آنکھوں دیکھا حال لکھا ہے۔ چند جملوں میں واقعہ کی تصویر کھینچ دی ہے۔

"یہاں جشن کے وہ سامان ہو رہے ہیں کہ اگر جمشید دیکھتا تو حیران رہ جاتا۔ شہر سے دو کوس پر آغا پور نام ایک بستی ہے۔ آٹھ دس دن سے وہاں خیام برپا تھے۔ پرسوں صاحب کمشنر مع چند میموں اور صاحبوں کے آئے اور خیموں میں اُترے۔ کچھ سو صاحب اور میم جمع ہوئے۔ سب سرکار رامپور کے مہمان۔ کل سہ شنبہ ۵ دسمبر حضور پرنور (نواب کلب علی خاں) بڑے تجمّل سے آغا پور تشریف لے گئے۔ بارہ پر دو بجے گئے۔ اور شام کو پانچ بجے خلعت پہن کر واپس آئے۔ وزیر خاں، خانِ سامان، خواص میں سے روپے پھینکتا آتا تھا۔ دو کوس کے عرصے میں دو ہزار سے کم نہ نثار کیا ہوگا۔ آج صاحبانِ عالی شان کی دعوت ہے۔ ٹِفن اور شام کا کھانا ڈنر یہیں کھائیں گے۔ روشنی اور آتش بازی کی وہ افراط ہے کہ رات دِن کا سامنا کرے۔ طوائف کا وہ ہجوم، حکام کا وہ مجمع کہ اس مجلس کو

طوائف الملوکی کہنا چاہیے۔

۶۔ مشفقانہ مشورہ | میر غلام حسنین کے نام

بندہ پرور! آپ کا خط لکھنؤ سے آیا۔ حالات معلوم ہوئے۔ یہ نہ معلوم ہوا کہ کیا کام آپ کے سپرد ہوا ہے؟ یہ بھی لکھئے۔ چند روز صبر کرو۔ اگر وطن ہوتے تو اس بیکاری میں گھر کی کیا خبر لیتے؟ جس طرح جب گزرتی اب بھی گزر جائے گی۔ بلکہ تمہارا خرچ کم ہوگا۔ بہرحال ابھی اضافہ کے واسطے تم نہ کہو۔ نہ میں لکھوں۔ دو چار مہینے کام کرو۔ اِس اثنا میں اگر بلگرام میں چھاپہ خانہ جاری ہوگیا تو استعفا دے کر چلے جائیو۔ یہاں بعد چند روز کے اضافہ ہونا بھی تو حیز امکان سے باہر نہیں۔

۷۔ سفارش | شہاب الدین خاں کے نام

نورِ چشم شہاب الدین خاں کو بعد دعا کے معلوم ہو کہ یہ جو رقعہ لے کر پہنچے ہیں۔ ان کا نام حسن علی ہے۔ اور یہ سیّد ہیں۔ دوا سازی

ہیں یگانہ، رکابداری میں یکتا۔

جان محمد ان کا باپ ملازمِ سرکارِ شاہی تھا اب ان کا چچا میر فتح علی پندرہ روپیہ مہینہ کا الور میں نوکر ہے۔ بہرحال اُن سے کہا گیا کہ پانچ روپیہ مہینہ ملے گا۔ اور لوہارو جانا ہوگا۔ انکار کیا کہ پانچ روپیہ میں کیا کھاؤں گا۔ یہاں زن و فرزند کو کیا بھیجوں گا۔ جواب دیا گیا کہ سرکار بڑی ہے۔ اگر کام تمہارا پسند آئے گا تو اضافہ ہو جائے گا۔ اب وہ کہتا ہے کہ توقع پر قلیل مشاہرہ قبول کرتا ہوں۔ مگر دونوں وقت روٹی سرکار سے پاؤں۔ بغیر اس کے کسی طرح نہیں جا سکتا۔

سنو۔ میاں! حق بجانب اس غریب کے ہے۔ روٹی بغیر بات نہیں بنتی۔ یقین ہے تم رپورٹ کر دو گے تو اِس امر کی منظوری کا حکم آجائے گا۔ یہ قصہ فیصل ہوا۔

اب یہ کہتا ہے کہ دو ماہ مجھے پیشگی دو۔ تاکہ کچھ کپڑا لتا بناؤں اور کچھ گھر میں دے جاؤں۔ راہ میں روٹی اور سواری سرکار سے پاؤں۔ تو یہاں بھی حق بجانب سائل کے جانتا ہوں۔ مگر کچھ نہیں کہہ سکتا۔ خیر! تم بھی رقعہ اپنے نام کا علائی مولائی کو بھیج دو۔

۸۔ فرمائش | نواب علاؤالدین خاں علائی کے نام

اقبال نشانا! بخیرو عافیت در فتح نصرت لوہارو پہنچنا مبارک ہو۔ مقصود ان سطور کی تحریر سے یہ ہے کہ مطبع اکمل المطابع میں چند احباب میرے مسوّدات اُردو کو جمع کرنے پر اور اس کے چھپوانے پر آمادہ ہوئے ہیں۔ مجھ سے مسوّدات مانگتے ہیں۔ اور اطراف و جوانب سے بھی فراہم کئے ہیں۔ میں مسوّدہ نہیں رکھتا۔ جو لکھا وہ جہاں بھیجنا ہوا۔ وہاں بھیج دیا۔

یقین ہے کہ میرے خط تمہارے پاس بہت ہوں گے۔ اگر ان کا ایک پارسل بنا کر بسبیلِ ڈاک بھیج دو گے یا آج کل میں کوئی ادھر آنے والا ہو اُس کو دے دو گے تو موجب میری خوشی کا ہو گا۔ اور میں ایسا جانتا ہوں کہ اِس کے چھاپے جانے سے تم بھی خوش ہو گے۔ بچوں کو دعا۔

۹۔ بیمار پرسی | منشی نبی بخش حقیر کے نام

بھائی صاحب! آپ کے عنایت نامے سے بھابی کے مزاج کی ناسازی اور بچّوں کی ناخوشی معلوم ہوئی۔ پروردگار سب کو اپنی امان میں رکھّے۔ دن بُرے ہیں۔ یہاں تپ کا مرض عام ہے۔ مگر انجام بخیر ہے۔ یہ سب خوبیاں مینہ نہ برسنے کی ہیں۔ خدا سے دعا مانگتا ہوں اور آپ سے چاہتا ہوں کہ آپ جلد سب کی خیریت لکھیں۔

مرزا یوسف علی خاں اگر ابھی وہاں سے نہ چلے ہوں تو اُن کو میری دعا کہنا کہ میاں! تمہارا خط آیا۔ تمہارے سب دوستوں کو سلام کہدیا۔ اب تم منشی صاحب پر سب امور حوالہ کر کے چلے آؤ۔ درنگ نہ کرو۔

غزل دیکھی۔ بھائی صاحب! اِن زمینوں میں مضامینِ عاشقانہ کی گنجائش کہاں؟ موافق اِس زمین کے اشعار مربوط ہیں۔ منشی عبداللطیف (فرزند) اور اُن کے فرزند، بیگم (دُختر) اور اس کی ہمجولیوں کو دعا۔

۱۰۔ نوّاب میر بابا خاں کے نام | گھڑی کے تحفہ کا شکریہ

بجناب نوّاب صاحب جمیل المناقب عمیم الاحسان سلمہ اللہ تعالیٰ

بعد سلام مسنون الاسلام ودعائے دوام دولت واقبال کہ ہمیشہ وردِ زبان ہے۔ گھڑی کے عطیہ کا شکریہ ہر گھڑی اور ہر ساعت بجالاتا ہوں۔ پہلے تو آپ دوست۔ اور پھر امیر اور پھر سیّد۔ نظر ان تین امور پر اِس ارمغاں کو میں نے بہت عزیز سمجھا۔ اور اپنے سر آنکھوں پر رکھّا۔ خدائے عالم آرائے آپ کو سلامت رکھّے اور ہر گھڑی آپ کا ممدّ ومددگار رہے۔ ظاہراً بوقتِ روانگی کنجی کا رکھنا سہو ہو گیا۔ خیر یہاں بن جائے گی۔ والسّلام بالوف الاحترام۔

احباب کا طالب۔ غالب

۱۱۔ والی ریاست کی عیادت | نوّاب یوسف علی خاں ناظمؔ، والی ریاست رامپور کے نام۔

حضرت ولیِّ نعمت۔ آیۂ رحمت سلامت۔

بعد از تسلیم ونیاز معروض ہے۔ جب سے حضرت کی ناسازی مزاج مبارک کا حال خارج سے مسموع ہوا ہے۔ عالمِ غیب گواہ ہے کہ مجھ پر اور میری بیوی پر اور میرے فرزند حسین علی خاں پر کیا گزر رہی ہے۔ ایک دن رات میرے گھر میں روٹی نہیں پکّی۔ ہم سب نے فاقہ کیا۔

بارے وہ خبر وحشت اثر غلط نکلی۔ حواس ٹھکانے پر آئے۔ بالکل اطمینان جب ہو گا کہ آپ کے غسلِ صحت کی نوید سنوں گا۔ اور قطعۂ دتاریخ غسلِ صحت لکھ بھیجوں گا۔ فی الحال اتنا چاہتا ہوں کہ اِس خط کا جواب پاؤں۔ اور حقیقتِ مرض سے آگاہی حاصل ہو۔ زیادہ حدِّ ادب۔

تم سلامت رہو ہزار برس
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار
تمہاری سلامتی کا طالب۔ غالبؔ

۱۲۔ ظرافت آمیز اظہارِ غضب | علاء الدین احمد خاں علائی کے نام

بداست مرگ مگر بدتر از گمانِ تو نیست

مکرّر لکھ چکا ہوں کہ قصیدے کا مسوّدہ میں نے نہیں رکھّا۔ مکرّر لکھ چکا ہوں کہ مجھے یاد نہیں۔ کون سی رباعیاں مانگتے ہو۔ پھر لکھتے ہو کہ رباعیاں بھیج۔ قصیدہ بھیج۔ معنی اِس کے یہ کہ تو جھوٹا ہے۔ اب کے تو مقرّر بھیجے گا۔ بھائی! قرآن کی قسم، انجیل کی قسم، توریت کی قسم، زبور کی قسم، ہنود کے چار بید کی قسم، دساتیر کی قسم، ژند کی قسم،

پازند کی قسم، اُستا کی قسم، گرو گرنتھ کی قسم، نہ میرے پاس وہ قصیدہ، نہ مجھے وہ رباعیاں یاد۔ ع. رہمانیم کہ ہستیم و ہماں خواہد بود۔ (اس کے بعد اور باتیں ہیں)

۱۳- تاکید و تنبیہ | منشی بسم اللہ خاں کے نام

منشی صاحب! شفیق مکرم، مظہر لطف و کرم منشی بسم اللہ خاں صاحب سلمہ اللہ تعالیٰ۔ صاحب! یہ نیا ڈھنگ ہے شکایت کا، اگر تمہارے کلام میں اصلاح کم ہو۔ تو وہ کلام کی خوبی ہے۔ اُس کو استاد کی سہل انگاری کیوں سمجھو۔ آپ کے منصف صاحب کی غزل میں اصلاح کم ہوتی ہے۔ پس اُن کو چاہئے کہ خوش ہوں نہ کہ مجھ سے گلہ کریں۔ سُنئے حضرت! خط میں تداخل[1] بُرا ہے۔ اگر یہاں کی ڈاک میں کھُل گیا تو مجھ سے میرے پاس روپیہ لئے جائیں گے۔ یا قید کا حکم ہوگا۔ آئندہ آپ خط جُدا گانہ بھیجا کیجئے۔ اس باب میں تاکید جانیئے۔ کوئی حیلہ جواز کا

---

[1] کسی اور کے خط میں خط رکھ کر بھیجنا۔

آپ کی طرف سے مسموع نہ ہوگا۔

۱۴۔ ہدایت | میر غلام حسنین قدر بلگرامی کے نام

حضرت! میں نے چاہا کہ حکم بجالاؤں اور عبارت کو اصلاح دوں، مگر میں کیا کر دوں؟ آپ غور کریں کہ اصلاح کی جگہ کہاں ہے؟ اگر بمثل آپ خود نظر ثانی میں کوئی لفظ بدلا چاہیں تو ہرگز جگہ نہ پائیں۔ جس کا غذ پر اصلاح منظور ہوتی ہے تو بین السطور (دو سطروں کا درمیانی فاصلہ) زیادہ چھوڑتے ہیں۔ جب اِس عبارت کو اور کاغذ پر نقل کر دں تب جا کر حک و اصلاح کا طور بنے۔ میرا کام اصلاحِ عبارت ہے نہ کتابت۔ (اِس کے بعد دوسری باتیں ہیں)

۱۵۔ شوخی اور ظرافت | منشی سیف الحق میاں داد خاں سیّاح کے نام

منشی صاحب سعادت و اقبال نشان سیف الحق میاں داد خاں سلّمکم اللہ تعالیٰ۔

نقیر کی طرف سے سلام دعا قبول کریں۔ چھوٹے صاحب کی

تصویر کی رسید میں بھائی محمد حسین خاں سے کہا گیا تھا کہ تم تصویر کے پہنچنے کی اطلاع دے دینا۔ سو، اب تمہاری تحریر سے معلوم ہوا کہ انھوں نے اطلاع دے دی۔

تصویر کا یہ کہ میں نے اُسے سر پر رکھا۔ آنکھوں سے لگایا۔ گویا چھوٹے صاحب کو دیکھا لیکن اِس کا سبب نہ معلوم ہوا کہ نواب صاحب نے ہم سے بات نہ کی۔ خیر۔ دیدار تو میسّر ہوا۔ گفتار بھی اگر خدا نے چاہا سُن لیں گے۔

دیکھو۔ منشی صاحب! آئینہ کی تصویر کو سب پسند کرتے ہیں۔ مگر فقیر اِس کا معتقد نہیں۔ اب دیکھو۔ حضرت کی تصویر میں کہنیوں تک ہاتھ کی تصویر سے آگے نہ پہنچے۔ اور پنجے کا پتہ نہیں مکالمہ ایک طرف مصافحہ کی بھی حسرت رہ گئی۔ اِس وقت جُدا گانہ خط لکھنے کی فرصت نہیں۔ نوّاب صاحب سے میرا بہت بہت سلام اور اشتیاق کہنا۔ بلکہ یہ خط اُن کو ضرور دینا کہ وہ پڑھ لیں۔ سادات کا نیاز مند اور علی کا غلام ع۔ بندۂ شاہِ شمائیم و ثنا خوانِ شما۔

نجات کا طالب۔ غالب

۱۶۔ منشی ہرگوپال تفتہ نے اپنے کلام کی اصلاح میں تاخیر اور مرزا صاحب کی بے اعتنائی کی طرف شاید اپنے خط میں اشارہ کیا ہے۔ اُسی خط کا یہ خط جواب معلوم ہوتا ہے۔

بزرگانہ شفقت

کاشانۂ دل کے ماہِ دوہفتہ منشی ہرگوپال تفتہ تحریر میں کیا کیا سحر طرازی کرتے ہیں۔ اب ضرور آپڑا کہ ہم بھی جواب اسی انداز میں لکھیں۔ سنو صاحب! یہ تم جانتے ہو کہ زین العابدین خاں مرحوم میرا فرزند تھا۔ اور اب اُس کے دونو بچے کہ وہ میرے پوتے ہیں۔ میرے پاس آرہے ہیں۔ اور دم بدم مجھ کو ستاتے ہیں۔ اور میں تحمّل کرتا ہوں۔ خدا گواہ ہے کہ میں تم کو اپنے فرزند کی جگہ سمجھتا ہوں۔ پس تمھارے نتائجِ طبع میرے معنوی پوتے ہوئے۔ جب اِس عالم کے پوتوں سے کہ مجھے کھانا نہیں کھانے دیتے۔ ننگے ننگے پاؤں میرے پلنگ پر رکھتے ہیں۔ کہیں پانی لڑھاتے ہیں کہیں خاک اڑاتے ہیں میں تنگ نہیں آتا تو ان معنوی پوتوں سے کہ ان میں یہ باتیں نہیں ہیں میں کیوں کر گھبراؤں گا۔ آپ ان کو جلد بسبیلِ ڈاک میرے پاس بھجوا دیجئے کہ میں ان کو دیکھوں۔ وعدہ کرتا ہوں کہ پھر

جلد ان کو تمہارے پاس بسبیلِ ڈاک بھیج دوں گا۔ حق تعالیٰ تمہارے عالمِ صورت کے بچّوں کو سلامت رکھّے اور تمہارے معنوی بچّوں یعنی نتائجِ طبع کو فروغِ شہرت و حُسنِ قبول عطا فرمائے۔

بابو صاحب کے نام کا خط اُن کے خط کے جواب میں پہنچتا ہے۔ اُن کو دے دیجئے گا۔ اور ہاں صاحب! بابو صاحب اور تم آبو جانے لگو تو مجھ کو اطلاع کرنا۔ اور تاریخِ روانگی لکھ بھیجنا۔ تاکہ میں بے خبر نہ رہوں۔ والدّعا۔ اسد اللہ خاں

۱۷۔ حکیم ظہیر الدین احمد خاں کو اُن کے بچپن میں اُن کے چچا نے توپ کا ایک کھلونا تحفہ کے طور پر دیا ہے۔

بھتیجے کی طرف سے شکریہ کا خط

اُن کی فرمائش پر اُن کا دل رکھنے کے لئے یہ خط بطور شکریہ اُن کی طرف سے مرزا صاحب نے اُن کے چچا کو لکھا ہے۔

ازجانب حکیم ظہیر الدین احمد خاں بنام نجم الدین حیدر خاں صاحب عَمِّم الیشاں۔

جنابِ فیض مآب چچا صاحب قبلہ و کعبۂ دو جہاں کے حضور میں

کورنش اور تسلیم بجا لاتا ہوں۔ اور ہزار زبان سے اِس توپ کے مرحمت فرمانے کا شکر بجا لاتا ہوں۔ سبحان اللہ! کیا توپ ہے جس کی آواز سے رعد کا دم بند اور رنجک کے رشک سے بجلی کو رنج۔ گولا اُس کا خدا کا قہر۔ دھواں اُس کا دریائے عشق کی لہر، استغفر اللہ! کیا باتیں کرتا ہوں۔ جھوٹ سے دم بھرتا ہوں۔ کیسی رنجک، کیسا دھواں، کیسا گراب۔ یہ وہ توپ ہے کہ بغیر ان عوارض کے صرف اِس کی آواز سے رستم کا زہرہ آب ہو جائے۔ آب بارود ہو تو رنجک اُڑے۔ آگ دہکائیں تو دھواں ہو۔ گولا چھرا اِس میں بھریں تو ظاہر میں کہیں نشان ہو۔ صرف اِس کی آواز پر مدار ہے۔ نئی ترکیب اور نیا کاروبار ہے۔ ایک آواز اور اُس میں یہ اعجاز کہ دوست کو فتح کی شلک کی صدا سنائے۔ دشمن سُنے تو ہیبت سے اُس کا کلیجہ پھٹ جائے۔ آواز کا صدمہ اگرچہ صدائے صور سے دونا ہے۔ مگر ہمیں یہی کہتے بن آتا ہے کہ صور کا نمونہ ہے۔ کیا خدا کی قدرت ہے۔ دیکھو تو کیسی ندرت ہے۔ توپ کا گولا توپ ہی میں رہ جائے اور جو قلعہ روبرو آئے وہ ڈھ جائے۔ دانا آدمی اُسے زنجیری گولا کہتا ہے۔

کہ توپ سے نکل کر پھر وہیں الجھ کر رہتا ہے۔

اچھے میرے چچا جان! یہ توپ کس نے بنائی۔ اور تمہارے ہاتھ کہاں سے آئی؟ جو دیکھتا ہے وہ حیران ہوتا ہے۔ اب شہر میں جا بجا اسی کا بیان ہوتا ہے۔ حق تعالیٰ شانہٗ تم کو ہمارے سر پر سلامت رکھے اور ہمیشہ بدولت و اقبال و عزّ و کرامت رکھے۔

ایک بچّے کے نام خط

مرزا صاحب کے خطوں کے دریا کے یہ چند موتی اِدھر اُدھر سے چن کر میں نے پیش کئے ہیں۔ دریا ابھی باقی ہے۔ جس کا جی چاہے ایسے اور بہت سے موتی چُنے اور اپنے دل و دماغ کی زینت بنائے۔ آخر میں، مرزا امیر الدین احمد خاں عُرف فرّخ مرزا کے نام کا خط درج کرتا ہوں۔ مرزا صاحب کا ایک خط بچّے کی طرف سے لکھا ہوا پیش کیا گیا۔ یہ دوسرا خط اُن کا ایک بچّے کے نام ہے۔ اِس کی دلچسپی کا ایک سبب یہ ہے کہ مرزا صاحب کے خطوں کے چھپنے کا حال سُن کر امیر الدین احمد خاں نے اُنھیں خط لکھا کہ "دادا جان! ہمارے نام کا بھی کوئی خط ہو تو

ان خطوں میں وہ بھی شامل کر دیا جائے"۔ اسی خط کے جواب میں مرزا صاحب نے اس کا دل رکھنے کے لئے یہ خط لکھا ہے۔

اے مردمِ چشمِ جہاں بینِ غالب! پہلے القاب کے معنی سمجھ لو یعنی چشمِ جہاں بینِ غالب کی پتلی۔ جہان میں تمہارا باپ مرزا علاء الدین خاں بہادر اور پتلی تم۔ آج میں نے تمہارا خط دیکھا۔ مجھ کو بہت پسند آیا۔ استادِ کامل نہ ہونے کے باوصف۔ تم نے یہ کمال حاصل کیا۔ آفریں صد آفریں!

میں اپنے اور تمہارے پروردگار سے کہ وہ رب العالمین ہے یہ دعا مانگتا ہوں کہ تم کو زیادہ نہیں تو تمہارے باپ کے برابر علم و فضل اور تمہارے پردادا حضرت فخر الدولہ نواب احمد بخش خاں بہادر جنت آرام گاہ کے برابر جاہ و جلال عنایت کرے۔ میاں! تمہارے دادا امین الدین خاں بہادر ہیں۔ میں تو تمہارا دلدادہ ہوں خبردار! ہر جمعے کو اپنی صورت مجھے دکھا جایا کرو۔ والدعا۔

دیدار کا طالب۔ غالب

پانچواں باب

مرزا غالب کے اخلاق و عادات

مرزا غالب کی زندگی اور اُن کی نظم و نثر سے اُن کے اخلاق و عادات پر کافی روشنی پڑتی ہے۔ پھر بھی مختلف کتابوں سے چند اور ضروری باتیں یہاں درج کی جاتی ہیں۔

مرزا صاحب خوش رو۔ خوش قامت اور با وقار آدمی تھے۔ کتابی چہرا، کشادہ پیشانی، آنکھیں روشن، عضو عضو دلکش اور متناسب تھا۔ جوانی میں ڈاڑھی منڈاتے تھے۔ بڑھاپے میں رکھ لی تھی۔ یہ اُن کے چہرے پر نہایت خوش نما معلوم ہوتی تھی۔

کھانا چاہے تھوڑا ہو، مزے دار پسند کرتے تھے۔ گرمی کے موسم میں نہار منہ مصری کے شربت کے ساتھ ٹھنڈائی پیتے تھے۔ دن چڑھے ناشتہ۔ دوپہر کو کھانے میں گوشت ضرور ہوتا تھا۔ پھلوں میں انگور اور آم بے حد پسند تھے۔ حُقّہ اور پان کا بھی شوق تھا شراب

پینے کی بُری لت جو جوانی میں پڑ گئی تھی۔ وہ مرتے دم تک نہ چھوٹ سکی۔ ذوقؔ ؎

اے ذوقؔ دیکھ دخترِ رز کو نہ منہ لگا
چھٹتی نہیں ہے منہ سے یہ کافر لگی ہوئی

اُن کا پہناوا بھی اُس زمانے کے شریف طبقہ کے رئیسوں جیسا تھا۔ کتابوں کا مطالعہ آپ کا دلچسپ مشغلہ تھا۔ کتابوں کا ذخیرہ کبھی نہیں کیا۔ کتابیں کرائے پر منگوائیں، پڑھیں اور واپس کردیں۔ مگر اُن کی یادداشت ایسی تھی کہ جو کچھ پڑھتے دل پر نقش ہوجاتا تھا۔ ذاتی مطالعہ ہی کی بدولت وہ علمی مسئلوں کو بڑی آسانی سے بہت جلد سمجھ لیتے تھے۔

رشتہ داروں سے محبّت تھی۔ شاگردوں پر شفقت فرماتے۔ دوستوں پر جان چھڑکتے اور ان کی فرمائشیں خوش دلی کے ساتھ پوری کرتے۔ بیوی کے آرام کا خیال رکھتے۔ اُن کی ضرورتوں سے کبھی غافل نہ ہوتے۔ بھائی کو دل سے چاہتے۔ ایک بار وہ بیمار ہوکر تندرست ہوئے تو خدا کی شکر گزاری اور بھائی کی الفت نے

یہ شعر کہلوایا ؎

دی مرے بھائی کو حق نے از سرِ نو زندگی
میرزا یوسف ہے غالبؔ یوسفِ ثانی مجھے

ملازموں پر مہربان رہتے۔ ضرورت مندوں کی مدد کرتے۔

مرزا صاحب کو بچّوں سے بڑا اُنس تھا۔ شاید اِس کی وجہ یہ ہو کہ اُن کا اپنا کوئی بچّہ زندہ نہ بچا تھا۔ انھوں نے اپنی محبّت اپنی بیوی کے بھانجے عارف کی اولاد پر صرف کی۔

حالات سے مجبور تھے۔ پھر بھی خودداری اُن کے خمیر میں تھی۔ انھوں نے دولتمندوں اور حاکموں کی مدح کی ہے۔ مگر کھلٹی اور خوشامدیں ایک خاص حد سے آگے نہیں بڑھے۔ وہ رکھ رکھاؤ کا بڑا لحاظ رکھتے تھے۔ اُنھوں نے اودھ کے وزیرِ سلطنت سے محض اِس لئے ملاقات نہیں کی کہ مرزا صاحب اُن سے اپنی شرطوں پر ملاقات چاہتے تھے۔

دِلّی کالج کی سو روپیہ ماہوار فارسی کی مدرّسی قبول کرنے سے اِس لئے انکار کر دیا کہ اِس ملازمت کی وجہ سے اُن کے سرکاری مقررہ

مرتبہ میں کمی آتی تھی۔

اُن کے اخلاق اور عادات کے بارے میں خواجہ الطاف حسین حالؔی نے (جو اُن کے شاگرد ہونے کی وجہ سے قریبی تعلق رکھتے تھے) اپنے خیالات اِس طرح ظاہر کیے ہیں۔

"مرزا صاحب کے اخلاق نہایت وسیع تھے۔ وہ ہر شخص سے جو اُن سے ملنے آتا خندہ پیشانی سے ملتے۔ اور اِس محبّت اور شفقت سے پیش آتے کہ آنے والے کا دل پھر اُن سے ملنے کو چاہتا۔ وہ دوستوں کو دیکھ کر باغ باغ ہو جاتے اور اُن کی خوشی سے خوش اور اُن کے غم سے غمگین ہوتے۔ اُن کے دوست ہر ملّت اور ہر مذہب میں بے شمار تھے۔ جو خط اُنھوں نے اُن کو لکھے ہیں۔ اُن سے یگانگت، محبّت، ہمدردی اور دلسوزی ظاہر ہوتی ہے۔"

جب تک طاقت رہی شاگردوں کے کلام کی دُرستی اور اصلاح اپنا فرض سمجھتے تھے۔ وہ اُن دوستوں کے ساتھ جو زمانے کی گردش سے مفلس اور محتاج ہو گئے تھے۔ بڑا اچھّا برتاؤ کرتے تھے۔

اُن کی تقریر بھی اُن کی تحریر کی طرح بڑی پُرلطف ہوتی تھی۔ کم

بولتے تھے مگر جو کچھ بولتے دل پر اُس کا اثر پڑتا۔

شاعر ہونے کے باوجود مشاعروں میں ادھاد ھند داد دینے سے پرہیز کرتے۔ ہاں۔ کوئی شعر پسند آتا تو اُس کی داد دل کھول کر دیتے۔ ذوقؔ کا یہ شعر بار بار پڑھتے اور تعریف کرتے۔ ؎

اب تو گھبرا کے یہ کہتے ہیں کہ مر جائیں گے
مر کے بھی چین نہ پایا تو کدھر جائیں گے

مومن خاں مومنؔ کے اِس شعر پر ؎

تم مرے پاس ہوتے ہو گویا جب کوئی دوسرا نہیں ہوتا

یہاں تک کہہ دیا۔ کہ کاش مومن میرا سارا دیوان لے لیتا اور مجھے یہ شعر دے دیتا۔

ایک صحبت میں نوّاب مرزا خاں داغؔ کے اِس شعر کو بار بار پڑھ کر وجد کرتے ؎

رُخِ روشن کے آگے شمع رکھ کر وہ یہ کہتے ہیں
اُدھر جاتا ہے دیکھیں یا اِدھر پروانہ آتا ہے

آخر میں یہ کہنا ضروری ہے کہ مرزا غالبؔ فرشتے نہیں انسان

تھے۔ ہماری طرح گوشت پوست کے انسان، بھول چوک کے بندے۔ مگر اُن کا دل اتنا فراخ تھا کہ اُس میں سب کی محبت کی گنجائش تھی۔ اُن کی وفات پر مولانا حالیؔ نے ایک بلند پایہ مرثیہ لکھا ہے۔ اِس کے چند شعروں سے مرزا صاحب کی عظمت کا اندازہ بخوبی ہو سکتا ہے:۔

بلبلِ ہند مر گیا ہیہات
جس کی تھی بات بات میں اک بات

نکتہ داں، نکتہ سنج، نکتہ شناس
پاک دِل، پاک ذات پاک صفات

تھیں تو دِلّی میں اُس کی باتیں تھیں
لے چلیں اب وطن کو کیا سوغات

اُس کے مرنے سے مر گئی دِلّی
خواجہ نوشہ تھا اور شہر برات

اب نہ دنیا میں آئیں گے یہ لوگ
کہیں ڈھونڈے نہ پائیں گے یہ لوگ

تمام شد

محمدؐ شفیع الدین نیّر
جمعہ ۔ ۲۴ مئی ۱۹۶۸ء

راجا زماں منزل ۔ سری نگر ۔ کشمیر ۔
بہ دولت کدہ[1] مرزا محمود بیگ صاحب دہلوی
پرو وائس چانسلر ۔ جموں و کشمیر یونیورسٹی ۔

[1] میری بیوی اور میں ایک ماہ تک مرزا صاحب کے مہمان رہے ۔ موصوف نے اپنے خلقی حسن خُلق اور تواضع کا اظہار اس طرح کیا کہ میں نہایت آسائش اور یکسوئی کے ماحول میں اس کتاب کو ختم کر سکا ۔ موصوف نے ازراہ کرم میری خواہش پر اس مسودہ کو پڑھ کر میری بیحد ہمت افزائی فرمائی ۔ ع

اجرش دہد خدائے کہ کرد ست یاوری

نیّر

مصنف کی دوسری کتابیں

تعلیمی اور اخلاقی کہانیاں

۱۔ سات آٹھ برس کے بچوں کے لیے

تارا کا ڈنڈا

بونے کا بٹوا

انار راجا

پری کی چھڑی

بطخ شہزادی

پرستان کی سیر

بونے کا انصاف

چُنن مُنن

ٹِلّو میاں

۲۔ آٹھ سے گیارہ برس کے بچوں کے لیے

بدھو کی بیوی

ریڈیو کا بھوت

میاں مٹھو

طلسمی مینا

کھلّو میاں

یادگار انگوٹھی

۳۔ گیارہ سے چودہ برس کے بچوں کے لیے

گھر کا آئینہ

عید کے کھلونے

پیسے کا صابن

مزدور کا بیٹا

باپ کی ناؤ

شیرخان کے معرکے

چھنگو منگو

نیرؔ صاحب کی تعلیمی نظموں کے مجموعے

سات آٹھ برس کے بچوں کے لیے

بچوں کا کھلونا

گھی شکّر

نئی کہانیاں

آٹھ سے گیارہ برس کے بچوں کے لیے

بچوں کا تحفہ حصہ اول

بچوں کا تحفہ حصہ دوم

تعلیمی تحفہ حصہ اول

تعلیمی تحفہ حصہ دوم

خاص لڑکیوں کے لیے

منّی کے گیت

منّی کا تحفہ

گیارہ سے چودہ برس کے لڑکوں اور لڑکیوں کے لیے

اسلامی نظمیں

وطنی نظمیں

ہماری نعت

سماجی اور دیہاتی اصلاح کے لیے

گاؤں سدھار گیت

پڑھ چکے نیر صاحب کی یہ کتاب!

کہو کیسی ہے؟ ان کی اور کتابیں بھی ایسی ہی اچھی اور مزے دار ہیں۔ نیر صاحب بچوں کے شاعر بھی ہیں اور ادیب بھی۔ جو کچھ لکھتے ہیں وہ دلچسپ بھی ہوتا ہے اور مفید بھی۔ آپ کی یہ کتابیں بھی پڑھو۔

جناب ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب فرماتے ہیں

.... اُن میں (نیر صاحب میں)، بچوں کے ذہن کو سمجھنے اور محبت کرنے کی وہ صفت ہے جو پیدائشی معلّم کا جوہر ہوتی ہے۔ نیز ذوق ادب اور ذوق جمال کی سمت بچوں کی رہنمائی کے لئے جس صلاحیت کی ضرورت ہے وہ اُن میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ بچوں کے لئے جو نظمیں اُنھوں نے لکھی ہیں وہ ایک پیش رو کی حیثیت سے اُن کا نہایت ہی بیش قیمت کارنامہ ہے۔ انھوں نے وہ میدان سر کیا ہے، جسے سر کرنے کی بہت ہی کم اصحاب نے جرأت کی ہے۔ اُن کی نظموں نے تعلیم کے خشک کام کو خوشگوار بنا دیا ہے۔ اُن بچوں میں بھی ادبی دلچسپی پیدا کرنے میں کامیاب ہوئی ہیں جو دوسرے مضمونوں کی طرح مادری زبان کی تحصیل کو غیر دلچسپ سمجھتے تھے......

ملنے کا پتہ
نیر کتاب گھر۔ جامعہ نگر۔ نئی دہلی